

تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ ایس۔ اُردو

جوش ملیح آبادی اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی آپ بیتیوں میں سیاسی شعور کا تقابلی مطالعہ

**A Comparative Study of Political Consciousness in
the Autobiographies of Josh Malihabadi and
Mahinder Singh Bedi Sehar**

نگران:

ڈاکٹر سائرہ بتول

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

محقق:

لائبہ فہیم عباسی

286-FLL/MSURDU/S22



شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد



الجامعة الإسلامية العالمية
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
شعبہ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ لائبہ فہیم عباسی رجسٹریشن نمبر 286-FLL/MSURDU/S22 نے ایم۔ ایس اُردو کی ڈگری تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان "جوش ملیح آبادی اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی آپ بیتیوں میں سیاسی شعور کا تقابلی مطالعہ" میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرفے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر سائرہ بتول

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو



پیش لفظ

اردو ادب کی تاریخ میں خود نوشت نگاری ہمیشہ سے ایک ایسا میدان رہی ہے جہاں مصنفین نے اپنے باطن کے نہاں خانوں کو لفظوں کے آئینے میں دیکھنے اور دکھانے کی جرات کی ہے۔ مگر جب یہ فن جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی "یادوں کا جشن" کی صورت میں سامنے آتا ہے تو یہ محض سوانحی بیانات نہیں رہتیں، بلکہ پورے عہد کی فکری، سیاسی اور روحانی کیفیات کا زندہ مرقع بن جاتی ہیں۔ اس مقالے میں جوش ملیح آبادی اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی آپ بیتیوں میں سیاسی شعور کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے کو چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب سیاسی شعور: بنیادی مباحث پر محیط ہے۔ اس باب میں حصہ الف میں شعور، سیاست اور سیاسی شعور کو بطور حوالہ تحریر کیا گیا ہے۔ جبکہ حصہ ب میں دونوں مصنفین کا تعارف (مہندر سنگھ بیدی کا اور جوش ملیح آبادی) اور دونوں آپ بیتیوں یعنی یادوں کی برات اور یادوں کا جشن کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کا دوسرا باب یادوں کی برات اور یادوں کا جشن میں سیاسی شعور پر مشتمل ہے۔ اس باب میں مصنفین کی آپ بیتیوں کو بنیادی مآخذ اور محققین کی آراء کے ضمن میں تحریر کیا گیا ہے۔ تیسرا باب یادوں کی برات اور یادوں کا جشن میں سماجی و عصری حالات و واقعات کی پیش کش کی صورت میں موجود ہے۔ اس باب میں دونوں مصنفین کی آپ بیتیوں سے سماجی و عصری حالات کو مختلف نکات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم یادوں کی برات اور یادوں کا جشن میں پیش کردہ ادبی منظر نامے کا احاطہ پیش کرتا ہے۔ اس باب میں مصنفین کی آپ بیتی میں موجود ادبی منظر نامے جو کہ شعراء کی محافل، مشاعروں وغیرہ کی صورت میں موجود تھے ان کو بمع اقتباسات تحریر کیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں تحقیقی سوالات کے پیش نظر ماحصل کو بھی تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں ماخذات بھی شامل ہیں۔

اپنے تحقیقی مقالے کی تکمیل میں، سب سے پہلے میں اس خدائے بزرگ و برتر کے حضور شکر گزار ہوں جس نے مجھے عقل و فہم کی روشنی عطا کی اور حقائق کو بصیرت کی نگاہ سے سمجھنے کی توفیق دی۔ اس کے بعد میں اپنے اس تحقیقی سفر میں بالخصوص اپنی نگرانِ مقالہ ڈاکٹر سائرہ بتول کی دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ جنہوں نے گاہے بگاہے میری راہ نمائی کی اور میری ہمت بندھاتی رہیں انہی کی بدولت میں یہ صبر آزمایہ مرحلہ

طے کر پائی۔ ان کی علمی بصیرت اور رہنمائی ہی وہ قوت تھی جس نے مجھے اس صبر آزما مرحلے کو مکمل کرنے کا حوصلہ دیا۔ یقیناً اگر میری نگرانِ مقالہ کی حوصلہ افزائی اور شفقت شامل حال نہ ہوتی تو میرے لیے اس مشکل کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ممکن تھا۔

اس کے بعد میں اپنی دیگر اساتذہ کی بھی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے قدم قدم پر مجھے حوصلہ دیا اور میری ہمت بندھائی یہی وجہ ہے کہ حوصلہ ہار جانے کے بعد بھی میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور الحمد للہ اس مقالہ کو مکمل کر پائی۔

علاوہ ازیں میں اپنے گھر والوں بالخصوص اپنے والدین کی بے حد مشکور ہوں۔ جنہوں نے ہر لمحہ اور ہر مرحلے پر میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ مجھے کسی بھی جگہ کمزور نہیں پڑنے دیا۔ میرے والدین نے اس دن کا بے حد انتظار کیا کیونکہ میری اس ڈگری کے اصل حقدار وہی ہیں جن کی دُعاؤں سے آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اُن کا سایہ ہم پر ہمیشہ قائم رکھے۔ (آمین)

اپنے بہن بھائیوں اور اپنی تمام دوستوں اور اُن لوگوں کی بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے کسی نہ کسی حوالے سے میرے اس تحقیقی کام میں میری راہنمائی اور مدد کی۔ اُن کے لیے ہمیشہ دُعا گور ہوں گی۔ اللہ پاک میرے ساتھ جڑے ہر رشتے کی زندگی میں خوشیاں لائے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

اختتامیہ میں، میں اپنے خالق و مالک، خدا تعالیٰ کے حضور سر اپا شکر ہوں جس نے مجھے شعور، فہم اور ہمت کی دولت سے نوازا اور اس قابل بنایا کہ میں کچھ اچھا سوچ سکوں، کچھ اچھا پڑھ سکوں اور کچھ اچھا لکھ سکوں۔ دراصل انسان کی تمام کاوشیں اسی وقت بامعنی ہوتی ہیں جب وہ اپنے رب کی عنایت کو پہچان لے کیونکہ کامیابی ہمیشہ اسی کی رہنمائی سے نصیب ہوتی ہے۔ یہ تحقیقی سفر میرے لیے صرف ایک علمی مرحلہ نہیں بلکہ خود شناسی اور شکر گزاری کا تجربہ بھی رہا جس نے مجھے یہ احساس دیا کہ محنت تب بار آور ہوتی ہے جب نیت خالص ہو اور دل یقین سے بھرا ہو۔

یقین ہو تو کوئی راستہ نکلتا ہے
ہوا کی اوٹ بھی لے کر چراغ جلتا ہے

لائبہ فہیم عباسی
ستمبر ۲۰۲۵ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	باب اول:	۲
	سیاسی شعور: بنیادی مباحث	۲
	سماجی شعور	۵
	تاریخی شعور	۷
	سیاسی شعور	۹
	مہندر سنگھ بیدی: تعارف	۱۵
	آپ بیتی یادوں کا جشن: تعارف	۲۴
	جوش ملیح آبادی: تعارف	۲۹
	آپ بیتی یادوں کی برات: تعارف	۳۴
	حوالہ جات	۳۷
۲۔	باب دوم:	۴۱
	یادوں کی برات اور یادوں کا جشن میں سیاسی شعور	۴۱
	مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی یادوں کا جشن میں سیاسی شعور	۴۲
	جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی یادوں کی برات میں سیاسی شعور	۵۹
	"یادوں کا جشن" اور "یادوں کی برات" میں سیاسی شعور کا تقابل	۶۸
	اشتراکات	۶۸
	افتراقات	۶۹
	حوالہ جات	۷۱
۳۔	باب سوم:	۷۳
	یادوں کا جشن اور یادوں کی برات میں سماجی و عصری حالات و واقعات	
	کی پیش کش	۷۳
	سماج: تعارف	۷۳

۷۵	عصر: تعارف
۷۸	یادوں کا جشن میں سماجی و عصری حالات و واقعات کی پیش کش
۷۹	تہذیب و ثقافت
۸۵	مذہبی حالات و واقعات
۸۸	اخلاقی اقدار
۹۲	معاشی حالات و واقعات
۹۳	یادوں کی برات میں سماجی و عصری حالات و واقعات کی پیش کش
۹۵	تہذیب و ثقافت
۱۰۲	مذہبی معاملات
۱۰۵	اخلاقی اقدار
۱۰۸	معاشی حالات و واقعات

یادوں کا جشن اور یادوں کی برات میں سماجی و عصری حالات و واقعات کا

۱۰۹	تقابل
۱۰۹	اشتراکات
۱۰۹	افتراقات
۱۱۱	حوالہ جات
۱۱۴	باب چہارم:

۱۱۴	یادوں کا جشن اور یادوں کی برات میں پیش کردہ ادبی منظر نامے
۱۱۵	یادوں کا جشن میں پیش کردہ ادبی منظر نامے
۱۲۸	یادوں کی برات میں پیش کردہ ادبی منظر نامے
۱۳۷	یادوں کا جشن اور یادوں کی برات کا تقابل
۱۳۷	اشتراکات
۱۳۸	افتراقات
۱۴۰	حوالہ جات

۱۴۳	ماحصل
۱۴۷	سفارشات
۱۴۹	فهرست مأخذ

باب اول:

سیاسی شعور: بنیادی مباحث

باب اول:

سیاسی شعور: بنیادی مباحث

انسانی معاشرہ ایک ہمہ گیر اور فطری نظام ہے جو انسان کی بنیادی ضروریات، باہمی تعلقات اور تعاون کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ انسان چونکہ فطرتاً سماجی مخلوق ہے، اس لیے وہ تنہائی میں زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جب ہم انسانی معاشرے کی ابتدا اور ارتقاء پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان اور معاشرے کا تعلق نہایت قدیم اور گہرا ہے۔

ابتدائی دور میں انسان انفرادی زندگی گزارنے کا عادی تھا اور اس کی تمام تر توجہ صرف خوراک، پانی اور رہائش جیسی بنیادی ضروریات تک محدود تھی۔ تاہم جب انسان نے اپنے ارد گرد کے ماحول کا مشاہدہ کیا اور اس کی ضروریات میں اضافہ ہوا تو اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا ان تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ یہی احساس انسان کو دوسرے انسانوں کے قریب لانے کا سبب بنا۔ رفتہ رفتہ یہ تعلقات باقاعدہ میل جول اور اشتراک میں بدل گئے اور انسان نے اجتماعی زندگی کی طرف قدم بڑھایا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں سے معاشرتی تشکیل کا آغاز ہوا اور انسان کی فطری سماجی جبلت نے ایک منظم شکل اختیار کر لی۔

ابتدائی انسانی اجتماعیت قبائل کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ انسان نے محسوس کیا کہ باہمی تعاون اور مشترکہ کاوشوں سے زندگی آسان اور محفوظ بنائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مختلف افراد نے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کیے اور ان تعلقات نے وقت کے ساتھ سماج کی بنیاد رکھی۔ جیسا کہ شاہد حسین ڈار لکھتے ہیں کہ

"زندگی بسر کرنے کے لیے اس کو دوسرے انسان کی مدد کی ضرورت پڑی۔ انسان ایک دوسرے کے قریب ہوتا گیا۔ اس کے اندر ہمدردی پیدا ہو گئی۔ انسان نے مختلف ضروریات زندگی کو پورا کرنے اور زندگی گزارنے کے لیے باہمی میل جول قائم کر کے سماج کی بنیاد رکھی اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی مادی ضروریات کی بنا پر سماج کا وجود ہوا۔" (۱)

معاشرے کی بنیاد انسان کی مادی اور حیاتیاتی ضرورتوں پر استوار ہے۔ انسان چونکہ فطرتاً وابستگی اور رفاقت کا خواہاں ہے اس لیے وہ اپنے گرد ایک ایسا نظام تشکیل دیتا ہے جس میں بقاء، تحفظ اور تسکین روح ممکن

ہو۔ معاشرتی نظام کے وجود میں آنے کے بعد انسانی زندگی نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ اس کے رہن سہن، عادات، رسم و رواج اور رویوں میں واضح تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

علاوہ ازیں، معاشرتی ترقی کے ساتھ انسان کا فکری اور شعوری ارتقا بھی جاری رہا۔ معاشرتی نظام نے جہاں زندگی کو منظم بنایا وہیں انسان کے علم اور ادراک کی وسعت میں بھی اضافہ کیا۔ انسان نے اپنے تجربات سے سیکھا کہ اچھا اور برا کیا ہے، عدل و ظلم میں کیا فرق ہے اور کون سے اصول زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ انسانی شعور نے معاشرتی تعامل کے ساتھ ترقی کی اور فکر و فہم کے نئے در واکے۔ شعور کے معنی عمومی طور پر جاننے، سمجھنے اور ادراک کرنے سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ یہ انسان کی وہ صلاحیت ہے جو اسے نہ صرف اپنے وجود بلکہ اپنے ماحول، اعمال اور ان کے نتائج کے بارے میں آگاہی عطا کرتی ہے۔ لہذا یہ کہنا بجا ہو گا کہ انسانی معاشرے کی بنیاد اگر باہمی تعاون ہے تو اس کی ترقی اور بقا کا راز انسانی شعور میں مضمر ہے۔ یہی شعور وہ قوت ہے جو انسان کو محض جاندار سے انسانِ کامل بننے کی طرف لے جاتی ہے اور یہی شعور معاشرتی ارتقا کی حقیقی بنیاد ہے۔

شعور عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے کہ آگاہ ہونا، واقف ہونا۔ کسی کام کے بارے میں حکمت عملی کا جو طریقہ کار اپنایا جاتا ہے وہ شعور کہلاتا ہے۔ شعور کو انگریزی میں (Consciousness) اور (Awareness) بھی کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قومی انگریزی اردو لغت میں شعور کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"شعور کے معانی احساس، آگاہی، وقوف، علم، باشعور یا آگاہ ہونے کی حالت، کسی چیز کی داخلی حیثیت، ذاتی وجود، حیات اور معلومات کا وقوف، اور مجموعی طور پر ایک فرد یا عوام کے اوسط خیالات اور احساسات کا علم شعور کہلاتا ہے۔" (۲)

شعور سادہ لفظوں میں اپنے آپ اور اپنے ماحول سے باخبر ہونے کا نام ہے۔ یہ انسان کی وہ صلاحیت ہے جو اسے اپنی ذات کو سمجھنے، پہچاننے اور اپنے گرد و پیش کے حالات کا ادراک کرنے کے قابل بناتی ہے۔ شعور دراصل عقل کی ایک لطیف کیفیت ہے جس میں ذہنی، انفرادی اور ذاتی بیداری شامل ہوتی ہے۔ یہ وہ فہم ہے جو انسان کو اپنے جذبات، احساسات اور طرز فکر کے بارے میں آگاہی عطا کرتی ہے۔ یہ اس وقت بیدار ہوتا ہے جب انسان اپنے وجود کے مقصد، اپنی ذمہ داریوں اور اپنے نظریات کو سمجھنے کی کوشش کرتا

ہے۔ اس میں دانش، حکمت اور سمجھ بوجھ کے ایسے عناصر شامل ہیں جو انسان کو نہ صرف اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں بلکہ اسے اپنے اعمال اور رویوں کا جائزہ لینے کی صلاحیت بھی دیتے ہیں۔

جامع علمی اُردو لغت میں شعور کی تعریف کچھ یوں ہے:

"شعور کے معنی دانائی عقل سلیقہ، ہوش، واقفیت اور پہچان ہونا ہے۔" (۳)

شعور دراصل انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ایک گہرا ربط ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو انسان کو معاشرتی، اخلاقی اور فکری سطح پر ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔ شعور وسعتِ نظر اور گہرائیِ فکر کا نام ہے۔ جب انسان اپنے ارد گرد کے مظاہر، حالات اور تجربات کو سمجھنے لگتا ہے تو اس کا شعور پختہ ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر شعور سے مراد وہ تجربہ یا کیفیت بھی لیا جاتا ہے جو کسی احساس یا عمل کے ذریعے ظاہر ہو۔ یہ کیفیت انسان کے اندر ایک بیداری پیدا کرتی ہے جو اسے زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتی ہے۔

"شعور اپنے اندر باطنی انتشار کو اخلاقِ صالح پر غالب نہ آنے دینے کا نام ہے۔

آپ کی عقل وحی کے تابع رہے۔ آپ کی خواہشات آپ کے مورال کمپاس سے

آگے نہ نکل جائیں۔ اس قوت، اس فیصلے، اس چوکیدار کا نام شعور ہے۔ یہ ہر

انسان میں پیدائشی طور پر بائے ڈیفالٹ بلٹ ان ہوتا ہے۔" (۴)

سائنس کے مطابق شعور سے مراد اپنے آپ سے آگاہ ہونا اور ہوش و حواس میں رہنا ہے۔ یہ انسان کی ذہنی بیداری اور فکری فعالیت کا وہ پہلو ہے جو اسے سوچنے، سمجھنے اور ردِ عمل ظاہر کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ دماغ میں ہونے والے شعوری عمل ایک منظم نظام کی طرح کام کرتے ہیں جو انسان کے خیالات، احساسات اور رویوں کو ترتیب دیتے ہیں۔ شعور دراصل انسانی دماغ کے اُن لطیف ترین افعال میں سے ایک ہے جو شخصیت کو توازن، ہم آہنگی اور انفرادیت بخشتے ہیں۔ یہ انسان کو محض ایک حیاتیاتی وجود سے بلند کر کے ایک فکری و اخلاقی ہستی بناتا ہے۔

شعور ایک یک رخی یا محدود تصور نہیں بلکہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر محیط ایک ہمہ گیر کیفیت ہے۔ شعور کی بنیادیں فرد کے تجربات، مشاہدات، ماحول اور تعلیم سے مل کر تشکیل پاتی ہیں اسی لیے یہ مختلف جہتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ انسان کا شعور صرف ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ وقت کے ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور یہ معاشرتی، تاریخی اور سیاسی میدانوں تک پھیل جاتا ہے۔ تاکہ یہ سمجھا جاسکے کہ انسان نہ صرف اپنے وجود سے آگاہ ہے بلکہ اپنے سماج، تاریخ اور نظامِ سیاست سے بھی فکری سطح پر جڑا ہوا

ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شعور کے مختلف روپ سماجی شعور، تاریخی شعور اور سیاسی شعور وغیرہ اپنے معنی اور اہمیت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

سماجی شعور:

سماج ہندی زبان کا لفظ ہے جو سنسکرت کے دو الفاظ "سم" اور "اج" سے مل کر بنا ہے۔ "سم" کا مطلب اکٹھا ہونا اور "اج" کا مطلب رہنا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے society کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو لاطینی زبان کے لفظ "سوسینس" سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بھی اکٹھے ہونے کے ہیں۔ سماج سے مراد صرف وقتی طور پر جمع ہونے والے افراد نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو ایک جگہ طویل عرصے سے ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اخلاقی، تہذیبی اور فکری رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ سماج ایسے افراد کا گروہ ہے جن کی ضروریات، مسائل اور مقاصد ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور جن کے درمیان باہمی تعاون، رفاقت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ سماج رسم و رواج، اقدار، روایتوں اور طرز زندگی کا مجموعہ ہے جو انسانوں کو ایک نظام کے تحت باندھے رکھتا ہے۔ یہی نظام حریت، مساوات اور باہمی احترام کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں ان اصولوں کے بغیر انسان اپنی شناخت اور توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ادب چونکہ زندگی کا عکاس ہے اس لیے اسے سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ ادیب بھی سماج کا ایک حصہ ہوتا ہے اور وہ اپنے مشاہدے، تجربے اور احساس کے ذریعے اس معاشرتی زندگی کو تحریر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اسی لیے ہر دور کا ادب اپنے عہد کے سماجی حالات کی واضح جھلک اپنے اندر سمیٹے ہوئے نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق

"میرے خیال میں ادب ایک سماجی فعل ہے اور چونکہ سماجی زندگی ہر لمحہ اور تغیر و تبدل سے ہم آغوش و ہمکنار رہتی ہے۔ اس لیے ادب بھی تعمیرات و انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ ہر دور کے ادب میں اس وقت کی سماجی تصویروں کا آنا ضروری ہے کیونکہ ادب بہر حال سماجی زندگی ہی کے درمیان پیدا ہوتا پاتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔ کسی قسم کا کوئی ادب اپنے ماحول، حالات و واقعات اور سماجی زندگی کے مختلف مسائل سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔" (۵)

ادب اور سماج کے مابین اس گہرے تعلق کے بارے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی قلم طراز ہیں:

"ادب کا سماج سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے۔ دراصل ادب اپنے سماج کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کا سوسائٹی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ادب پر اس دور کی سماج کی تحریکات کا اثر پڑتا ہے اور عوام کے رجحانات کا عکس ملتا ہے۔" (۶)

ادب اور سماج کا تعلق ہمیشہ سے گہرا اور ناقابل انکار رہا ہے کیونکہ ادب کا وجود سماج سے الگ نہیں ہوتا۔ ہر ادبی تخلیق اپنے عہد کے معاشرتی حالات کی نمائندگی کرتی ہے اور ادیب اپنے معاشرے کے دکھ سکھ، خوشی غمی، انصاف و نا انصافی، امن و انتشار جیسے تمام پہلوؤں کو اپنی تحریروں میں منعکس کرتا ہے۔ جب سماج میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو اس کا اثر براہ راست ادب پر بھی پڑتا ہے کیونکہ ادیب اسی معاشرتی فضا کا حصہ ہوتا ہے۔ ادیب کے خیالات اور تجربات دراصل اس عہد کی روح کے عکاس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کا ادب اس کے سماجی حقائق اور انسانی رویوں کا عکس پیش کرتا ہے۔ سماج افراد کے باہمی تعلقات، اقدار، روایتوں اور نظام زندگی کا مجموعہ ہے جس کے بغیر انسان کی شناخت ادھوری رہتی ہے۔ جب انسان اپنے معاشرتی ماحول کو سمجھنے لگتا ہے، اپنے ارد گرد ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتا ہے اور ان پر شعوری رد عمل ظاہر کرتا ہے تو یہی کیفیت اس کے سماجی شعور کی بنیاد بنتی ہے۔ سماجی شعور دراصل وہ آگاہی ہے جو انسان کو اپنے معاشرے کے مسائل، قدروں، رویوں اور تبدیلیوں کے بارے میں باخبر رکھتی ہے۔ یہ شعور انسان کو نہ صرف اپنے کردار کا احساس دلاتا ہے بلکہ اسے اس بات کی سمجھ بھی دیتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی بہتری کے لیے کس طرح مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔ سماج افراد کے مجموعے سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ معاشرے میں انسانوں کا آپس میں مل جل کر رہنا اور ایک دوسرے کے متعلق آگاہی ہونا سماجی شعور کے ضمن میں آتا ہے۔ ہر معاشرے کے اپنے اصول و قوانین ہوتے ہیں اور ہر فرد اپنے معاشرے کے مطابق، معاشرے میں ہونے والے معاملات کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ کسی بھی فرد کا معاشرتی مسائل کو جاننا، اس کا ادراک رکھنا ایک فرد کا سماجی شعور کہلائے گا۔

اردو لغت میں سماجی شعور کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"سماجی شعور معاشرتی حالات و مسائل سے آگاہی۔" (۷)

انگریزی لغت کے مطابق

"سماجی شعور دراصل ان مسائل سے آگاہی اور واقفیت کا نام ہے جو سماج میں موجود لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً غربت بے سرو سامانی صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کی حتی الامکان مدد بھی کرنا۔" (۸)

سماجی شعور کا اصل مطلب مختصر طور پہ معاشرے کے حالات کو نہ صرف جاننا بلکہ متعلقہ مسائل کو حل کرنا بھی سماجی شعور کا ہی حصہ ہے۔ کسی بھی معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے عقائد و نظریات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اس طرح ایک معاشرے میں رہنے والے انسانوں کا سماجی شعور بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے ہر ایک انسان معاشرے کو الگ انداز سے جانچتا ہے اور الگ انداز سے دیکھتا ہے یہی کسی فرد کا سماجی شعور کہلاتا ہے۔ سماجی شعور رکھنے والا انسان اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے ارد گرد کی بھی فکر رکھتا ہے اور اس میں بہتری لانے کی کوشش کرتا ہے۔ سماجی شعور کسی بھی معاشرے کے حالات کی اچھائی اور برائی کو سمجھنے کا نام ہے۔ اس کے مسائل کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے یہی سماجی شعور کے اہم نکات ہیں۔

تاریخی شعور:

تاریخ دراصل انسان کے ماضی، اس کے اعمال، تجربات، اور تمدنی ارتقا کا جامع ریکارڈ ہے۔ یہ محض گزری ہوئی باتوں کا بیان نہیں بلکہ انسانی شعور اور اجتماعی زندگی کی وہ داستان ہے جس میں انسان کے ارتقائی سفر کے تمام نشانات محفوظ ہیں۔ اگر ہم تاریخ کی تعریف کو وسعت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف بادشاہوں، جنگوں اور سلطنتوں کی کہانی نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا آئینہ ہے۔ زمان و مکان کے لحاظ سے واقعات کی ترتیب اور ان کے اسباب و نتائج کے علم کا نام ہے جو اقوام و انسانوں کی اجتماعی زندگی کا مرقع پیش کرتی ہے۔

"کشاف اصطلاحات تاریخ" میں تاریخ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"تاریخ انسانی زندگی کے گزشتہ واقعات، تحریکات اور ان کے اسباب اور نتائج کے تحریری سرمائے کا نام ہے۔ یہ انسان کے معاشرتی، سیاسی، تمدنی، ثقافتی اور مذہبی تصورات کی داستان ہے۔ یہ روایات کہن اور نقوش پارینہ کا خزانہ ہوتی ہیں۔ یہ ندی کے اس صاف و شفاف پانی کی مانند ہے جس میں اقوام اپنا چہرہ صحیح طور پر دیکھ سکتی ہیں۔" (۹)

تاریخ صرف ماضی کا بیان نہیں بلکہ ماضی سے سیکھنے اور حال و مستقبل کے لیے رہنمائی حاصل کرنے کا ایک زندہ اور شعوری عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جب اپنی تاریخ میں جھانکتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے گزرے ادوار کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لیتا ہے بلکہ ان سے سبق حاصل کر کے اپنے حال کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اگر انسانی معاشرے کی تاریخ کو کھنگالا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان نے غار

کی تنہائی چھوڑ کر دوسرے انسانوں سے میل جول بڑھایا اور باہمی رفاقت و تعاون کی بنیاد پر قبائل تشکیل دیے تو تاریخ انسانی کا آغاز ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ انسان نے مشاہدے، تجربے اور شعور کی مدد سے ترقی کی منازل طے کیں۔

" تاریخ نے انسان کے ساتھ ہی جنم لیا لہذا انسانی معاشرے یا اس کے کسی حصے کے آغاز، ارتقاء، ترقی اور تنزل کے بارے میں معلومات کا علم تاریخ کہلاتا ہے۔" (۱۰)

تاریخ انسان کی پیدائش اور اس کے اجتماعی سفر کے ساتھ ہی وجود میں آئی۔ یعنی تاریخ وہ علم ہے جو انسان اور اس کے معاشرے کی ابتدا، ترقی اور زوال کے تمام مراحل کا بیان کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کی بدلتی ہوئی شکلوں، انسان کی جدوجہد اور اس کی کامیابیوں و ناکامیوں کے ریکارڈ نے رفتہ رفتہ تاریخ کی صورت اختیار کر لی۔ انسان نے اپنے تجربات کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے مختلف ذرائع اپنائے۔ کبھی زبانی روایات کی صورت میں اور کبھی تحریری ریکارڈ کے ذریعے اس نے اپنے ماضی کو محفوظ کیا تاکہ آنے والے لوگ جان سکیں کہ ان کے اجداد نے کن حالات میں زندگی بسر کی اور ترقی کی راہیں کیسے تلاش کیں۔ تاریخ نہ صرف انسان کو اس کے ماضی سے جوڑتی ہے بلکہ یہ اس کے حال اور مستقبل کو سمجھنے کے لیے بھی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

تاریخی شعور دراصل انسانی فکر و آگہی کی وہ جہت ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان ایک فکری رشتہ قائم کرتی ہے۔ تاریخ محض بیتے ہوئے ادوار کی کہانی نہیں بلکہ انسانی تہذیب و تمدن کی روح ہے۔ یہ انسان کے اجتماعی شعور، ترقی، زوال، کامیابیوں اور ناکامیوں کی عکاسی کرتی ہے۔ جب کوئی قوم یا فرد اپنی تاریخ سے بے خبر ہوتا ہے تو وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے، کیونکہ تاریخ ہی وہ آئینہ ہے جس میں ہم اپنی اصل، اپنی قدروں اور اپنے تہذیبی سفر کو دیکھ سکتے ہیں۔ کسی بھی مہذب معاشرے کے فکری ارتقا میں تاریخ کا مطالعہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ مطالعہ انسان کو اس کے ماضی سے رشتہ جوڑنے اور اس کے اثرات کو حال اور مستقبل میں سمجھنے کا شعور بخشتا ہے۔ چنانچہ تاریخی شعور نہ صرف ماضی کی آگاہی کا نام ہے بلکہ یہ شعور انسانی عقل و وجدان کو راستہ دکھانے والی مشعل بن جاتا ہے۔

تاریخی شعور وہ بصیرت ہے جو انسان کو اپنے وجود کی جڑوں تک پہنچنے کا احساس عطا کرتی ہے۔ یہ شعور انسان کو یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ اس کے ماضی کے تجربات، فیصلے، اور جدوجہد آج کے حالات پر کس

طرح اثر انداز ہوئے ہیں۔ تاریخی شعور کے ذریعے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ ایک زمانے میں کیے گئے اعمال و فیصلے آنے والے ادوار کے لیے بنیاد بن جاتے ہیں۔ یہی شعور قوموں کو ارتقا اور زوال کے اسباب کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور انہیں اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کرنے اور آئندہ بہتر فیصلے کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے ماضی کو فراموش کر دے تو وہ اپنی شناخت، ثقافت، اور اقدار کے سلسلے کو بھی کھودیتی ہے، کیونکہ تاریخ صرف ماضی کا بیان نہیں بلکہ مستقبل کی سمت طے کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

"تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں قومیں اپنی اصل کو پہچانتی اور اپنے مستقبل کو روشن کرتی ہیں۔" (۱۱)

تاریخی شعور قوموں کے لیے فکری استحکام اور تہذیبی بیداری کا سرچشمہ ہے۔ جب انسان اپنے ماضی کے شعور سے بہرہ ور ہوتا ہے تو وہ محض واقعات کا حافظ نہیں رہتا بلکہ ان واقعات کے معانی اور اثرات کو بھی سمجھنے لگتا ہے۔ یہی شعور انسان کو اپنی روایات، اقدار، اور ثقافتی ورثے کی حفاظت پر آمادہ کرتا ہے۔ ماضی کے تجربات سے حاصل ہونے والا سبق انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں سے کیسے بچ سکتا ہے اور اپنی طاقتوں کو کیسے نکھار سکتا ہے۔ تاریخی شعور کا حاصل یہی ہے کہ یہ انسان کو زمان و مکان کی قید سے بلند کر کے اسے تسلسل حیات کا ادراک عطا کرتا ہے۔ اس شعور کی بدولت قومیں اپنی بقا کی راہیں تلاش کرتی ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے فکری و تہذیبی بنیادیں استوار کرتی ہیں۔ درحقیقت، تاریخی شعور ہی وہ قوت ہے جو انسان کو ماضی کے ورثے سے جوڑ کر حال کو بہتر بنانے اور مستقبل کو روشن کرنے کی صلاحیت بخشتا ہے۔

سیاسی شعور:

لفظ سیاست عربی زبان سے ماخوذ ہے جس کے معنی تدبیر، حکمت اور فہم و فراست کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر سیاست سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے ریاست کے عوام کے مسائل کو حکمران طبقے تک پہنچایا جاتا ہے اور ان کے حل کے لیے عملی تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ سیاست کا بنیادی مقصد عوامی مفادات کی نگہبانی اور ریاستی امور کی منصفانہ تنظیم ہے۔

تاریخی طور پر سیاست کا آغاز یونانِ قدیم کی شہری ریاستوں سے ہوا۔ انگریزی لفظ Politics دراصل یونانی لفظ Polis سے نکلا ہے، جس کے معنی "شہر" یا "شہری ریاست" کے ہیں۔ یونانی معاشرے میں سیاست ہر اس معاملے سے متعلق تھی جو ریاست اور عوامی فلاح سے جڑا ہو۔ وہاں جمہوریت کا ابتدائی تصور موجود تھا، جس میں مخصوص افراد کی رائے لے کر حکومت تشکیل دی جاتی تھی۔

سیاست دان وہ شخص کہلاتا ہے جو نہ صرف عوامی رائے کو سمجھنے اور پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو بلکہ اقتدار میں آ کر عوامی مسائل کے حل کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ ایک کامیاب سیاست دان معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے۔ عوام کے بدلتے ہوئے رویوں سے آگاہ رہتا ہے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی پالیسیوں اور فیصلوں میں لچک پیدا کرتا ہے۔ یوں سیاست دراصل فہم، بصیرت، اور بروقت فیصلوں کا نام ہے جو ریاست اور عوام کے درمیان رشتہ استوار رکھتی ہے۔

فرہنگ تلفظ کے مطابق:

"سیاست کے معنی حکمرانی، حکمت عملی، ملکی امور، مصلحت اندیشی اور حصول اقتدار کے مفادات کے لیے جدوجہد ہے۔" (۱۲)

سیاست سے مراد حکمت، دانائی یا سوچ ہے جس کے تحت کسی نظام کی قیادت کی جاتی ہے۔ ملک یا معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کوئی انسان مقرر کیا جاتا ہے اس تک ملک کے رہنے والوں کے مسائل پہنچانا اور ان مسائل کے حل پیش کرنا سیاست کہلاتا ہے۔

قومی انگریزی اردو لغت میں سیاست کی تعریف کچھ یوں ہے:

"قومی انگریزی اردو لغت میں "سیاست" سے مراد حکومت کاری کا علم، کسی حکومت، قوم یا کسی ملک کی حکمت عملیاں اور مقاصد سیاسی جماعتوں کے طور طریقے اور ان کے مقابلے سیاسی معاملات، کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد ان لوگوں کی ریشمیہ دوانیاں یا منصوبہ بندیاں جو ذاتی طاقت شان و شوکت، منصب یا اسی قسم کے دیگر مقاصد ہوں۔" (۱۳)

گویا سیاست سماجی زندگی کا وہ لائحہ عمل ہے جو کسی علاقے ملک یا ریاست کے کاروبار حکومت کو سنبھالنے اور سیاسی عمل عوام الناس اور ریاست کے درمیان پل کا کردار ادا کرتا ہے۔

سیاست طاقت کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کے ذریعے ایک انسان دوسرے انسانوں کے معاملات کو سنبھالنے کی جدوجہد کر رہا ہوتا ہے۔ سیاست ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک انسان دوسرے انسان کی زندگی میں دخل انداز ہوتا ہے۔ جو انسانوں کو انفرادی اور مجموعی زندگی کی خاطر ایک مخصوص حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور کر سکے یا ترغیب دے سکے۔ ارسطو نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف (Politics) کی ابتداء میں بیان کیا ہے کہ انسان فطرت کے اعتبار سے ایک سیاسی حیوان ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سماجی زندگی کی حقیقت سیاست (Politics) میں پوشیدہ ہے اور معاشرے کے بغیر انسانی زندگی نامکمل ہے اور اس طرح

سیاسی معاشرہ یعنی ریاست کے بغیر بھی اس کی زندگی نامکمل ہے۔ کیونکہ ریاست کی رکنیت اختیار کر کے ہی فرد میں تہذیب و تمدن سے واقفیت اور سیاسی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

کیونسی رائے (Quincy wright) کے مطابق:

"سیاست سے مراد وہ فن ہے جس کے ذریعے کچھ گروہوں کو متاثر کر کے
سبکدوشی سے گھٹ جوڑ یا کنٹرول کر کے دوسروں کی مخالفت میں کسی ایک گروہ
کے مقصد کو فروغ دیا جاتا ہے۔" (۱۴)

سیاست دراصل ایسا لائحہ عمل ہے جس کے ذریعے کوئی فرد اپنی فکری برتری، گفت و شنید کی قوت، اور فیصلوں کی صلاحیت کے بل پر ایک بڑے گروہ یا پوری قوم پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ سیاست کا مقصد محض اقتدار حاصل کرنا نہیں بلکہ نظم اجتماعی کو سنبھالنا، ریاستی معاملات کو درست سمت میں چلانا اور لوگوں کے لیے ایک مربوط نظام زندگی قائم کرنا ہوتا ہے۔ ایک سچا سیاست دان وہی ہے جو اپنی سوچ، تجربے اور بصیرت سے عوام کی رہنمائی کرے، نہ کہ ان پر محض حکمرانی۔ چنانچہ سیاست کو اقتدار نہیں بلکہ خدمت، فہم اور تدبیر کی راہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

سیاست دان وہ شخصیت ہے جو عوام کے رجحانات اور معاشرتی تقاضوں کو نہ صرف سمجھتی ہے بلکہ ان کے مطابق پالیسیاں تشکیل دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ وہ معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر وقت کے تقاضوں کو بھانپتا ہے اور اپنی گفتگو، فیصلوں اور حکمت عملی سے عوام کے اعتماد کو حاصل کرتا ہے۔ ایک قابل سیاست دان وہ ہوتا ہے جو اپنی ذات کے بجائے قوم کے مفاد کو مقدم رکھے، اختلاف رائے کو برداشت کرے اور عوامی مسائل کے حل کے لیے عملی اقدامات کرے۔ یوں سیاست دان صرف حکمران نہیں بلکہ ایک باشعور رہنما ہوتا ہے جو قوم کی فکری سمت طے کرتا ہے۔ سیاست دان کا لفظ صحیح معنوں میں ایسی شخصیت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو معاشرے کی صورت حال کو نہ صرف بیان کرتا ہے بلکہ حکام اعلیٰ تک موجودہ مسائل بھی پہنچاتا ہے اور مسائل کے حل کے لیے مشاورت بھی کرتا ہے۔ اچھا اور کامیاب سیاست دان عوام کے مسائل کو سمجھتا ہے اور اسی حساب سے اپنی حکمت عملی کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے کہ کب کیا کرنا ہے۔ سیاست دان بنیادی طور پر معاشرے کے افراد کی نمائندگی کرتے ہیں اور معاشرے کے مسائل کو عہد داران تک پہنچاتے ہیں۔ سیاست دان نہ صرف ہر وقت کی بدلتی ہوئی مجموعی صورت حال سے واقف ہوتا ہے بلکہ روزمرہ میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان کے حل کی خاطر بہتر اقدامات اٹھاتا ہوتا ہے۔ جو عوامی امنگوں کے

ترجمان ہوتے ہیں۔ سیاست دان مجلس شعور میں عوامی رائے کے مطابق قوانین کو تشکیل کر کے معاشرتی زندگی کو آسان سے آسان تر بنانے کی ہر ممکن تگ و دو کرتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے سیاسی شعور کی ابتدا ہوتی ہے۔ سیاسی شعور اس آگاہی کا نام ہے جو فرد کو اپنے حقوق، ریاستی ڈھانچے، اور اجتماعی ذمہ داریوں سے روشناس کراتی ہے۔ ایک باشعور قوم ہی ایسے رہنماؤں کو جنم دیتی ہے جو مفاد عامہ کو مقدم رکھتے ہیں۔ جب عوام میں سیاسی شعور بیدار ہوتا ہے تو سیاست ذاتی مفاد کی دوڑ کے بجائے اجتماعی بھلائی کی راہ بن جاتی ہے۔ اس طرح سیاست دان اور عوام کے درمیان ایک فکری ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جو حقیقی جمہوریت کی بنیاد بنتی ہے۔

لفظ "شعور" احساس یا جذبے سے بالاتر ایک عقلی و فکری سطح کو واضح کرتا ہے۔ شعور دل کی واردات نہیں بلکہ عقل کی پیداوار ہے۔ یہ وہ فکری روشنی ہے جو انسان کو سوچنے، سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ شعور کا تعلق جذبات سے کم اور عقل و منطق سے زیادہ ہے کیونکہ یہ علم، تجربے اور استدلال کے ذریعے جنم لیتا ہے۔ یہی وہ شعور ہے جو انسان کو عام فہم سے ممتاز کرتا ہے اور اسے باتوں کو محض سننے کے بجائے سمجھنے، اور حالات کو محسوس کرنے کے بجائے ان کا تجزیہ کرنے کی قوت دیتا ہے۔

جب اسی شعور کے ساتھ "سیاسی" کا سابقہ لگایا جاتا ہے تو مفہوم اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ سیاسی شعور دراصل اس عقل عملی کا نام ہے جو فرد کو ریاست، حکومت اور عوامی معاملات کی باریکیوں سے آگاہ کرتی ہے۔ یہ وہ ذہنی آگاہی ہے جو انسان کو بتاتی ہے کہ اقتدار کا مطلب صرف حکومت کرنا نہیں بلکہ ذمہ داری اٹھانا ہے۔ سیاسی شعور رکھنے والا فرد یہ جانتا ہے کہ ریاست کی بنیاد عدل، مساوات اور عوامی فلاح پر ہونی چاہیے۔ یوں سیاسی شعور انسان کو محض ایک شہری نہیں بلکہ ایک باشعور شہری بناتا ہے جو اپنی رائے، حق انتخاب اور اجتماعی فلاح کے مفہوم کو بخوبی سمجھتا ہے۔

بقول خورشید ندیم

"شعور" کا لفظ خود بول کر بتا رہا ہے کہ اس کا تعلق دماغ سے ہے، دل سے نہیں۔ یہ ایک فکری سرگرمی کا حاصل ہے۔ کوئی قلبی واردات نہیں۔ یہ عقل کی کوکھ سے جنم لیتا اور فراست کی گود میں پروان چڑھتا ہے۔ اس کو علم و استدلال سے ناپا جاتا ہے اور منطق کی زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔ شعور سے پھوٹا ہوا مقدمہ عقلی ہوتا ہے جسے مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔ اس کے

ساتھ جب ہم "سیاسی" کا سابقہ لگاتے ہیں تو اس سے مراد وہ ذہنی سرگرمی ہے جو سیاست و ریاست سے متعلق ہے۔" (۱۵)

سیاسی شعور سے مراد یہ ہے کہ فرد کو معاشرے میں ہونے والے مسائل سے آگاہی ہو اور سب سے بڑھ کر ملک اور ملکی حالات و واقعات سے آشنائی ہو۔ کسی فرد کا اس کے حقوق و فرائض کو سمجھنا اور جانچنا اس کا سیاسی شعور کہلائے گا۔ سیاسی شعور رکھنے والا انسان ملک یا قوم کے مسائل کو بخوبی سمجھتا ہے اور ان مسائل کو حکمرانوں تک پہنچاتا ہے یہی کوشش انسان کا سیاسی شعور کہلاتی ہے۔

سیاسی شعور رکھنے والا انسان صرف ذاتی حیثیت میں چیزوں کو نہیں سمجھتا بلکہ وہ ملک و قوم کو بھی مد نظر رکھتا ہے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر بات حکام بالا تک پہنچاتا ہے۔ کسی بھی انسان کا اپنے حقوق کو پہچاننا اور ان کے لیے تگ و دو کرنا اس کا سیاسی شعور کہلاتا ہے۔ سیاسی شعور بنیادی طور پر اپنے حقوق اور اپنے فرائض کی پہچان ہے اسی لیے اس کا تعلیم سے گہرا تعلق ہے کیونکہ جو فرد تعلیم سے ہمکنار نہیں ہو گا اس کو اپنے حقوق سے آگاہی نہیں ہو گی اس لیے سیاسی شعور کو سمجھنے کے لیے تعلیم بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ عوام کا صحیح رائے دینا اور بہترین انتخاب کرنا بھی سیاسی شعور کی ہی کار فرمائی ہے۔

"سیاسی شعور، سیاسی دائرہ اور سیاسی فہم و فراست کا نام ہے۔ یہاں ہمہ وقت سیاست، ریاست اور عوام الناس سے ہر وقت باخبر رہنا پڑتا ہے۔۔۔ سیاسی شعور کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی عوامی نمائندہ یا پھر شہری، ریاست، عوام اور حکومت کے درمیان تعلقات کی بات کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے سیاسی شعور سے دوسرے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے اور وہ امور حکومت و حکمرانی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور حکومتی کارکردگی پر کھل کر بات کرتا ہے۔" (۱۶)

سیاسی شعور سے مراد سیاسی معاملات کو سمجھنے اور ان کی گہرائی میں اترنے کی صلاحیت ہے۔ یہ دراصل فہم و فراست، مشاہدہ اور بصیرت کا ایسا امتزاج ہے جو انسان کو معاشرے کی تبدیلیوں، اس کے رویوں اور مختلف نقطہ نظر سے آگاہ رکھتا ہے۔ سیاسی شعور رکھنے والا شخص محض اقتدار یا سیاست کے کھیل سے واقف نہیں ہوتا بلکہ وہ معاشرتی ڈھانچے، عوامی مسائل اور ریاستی نظام کے باہمی تعلق کو سمجھتا ہے۔ ایسے فرد کا کسی خاص طبقے سے وابستہ ہونا ضروری نہیں، وہ کوئی بھی عام شہری ہو سکتا ہے جو عوام اور حکومت کے درمیان رابطے کا پل بنے۔ سیاسی شعور رکھنے والا شخص نہ صرف حکومت کے اچھے اقدامات کو سراہتا ہے بلکہ خامیوں پر بھی دلیل اور فہم کے ساتھ تنقید کرتا ہے۔ اس کا نظریہ وقت اور حالات کے ساتھ ارتقاء پاتا ہے کیونکہ معاشرے کے تغیرات انسان کی سوچ کو بدلتے رہتے ہیں اور یہی سوچ سیاسی شعور کی بنیاد بنتی ہے۔

سیاسی شعور دراصل ایک ایسا داخلی احساس ہے جو انسان کو یہ سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے کہ اس کی آواز اور رائے ریاستی نظام کا لازمی حصہ ہے۔ ہر شخص میں کسی نہ کسی سطح پر سیاسی شعور ضرور موجود ہوتا ہے، خواہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ کچھ لوگ اپنے خیالات کو کھلے عام بیان کرتے ہیں، مثلاً تجزیہ نگار، کالم نویس، صحافی یا مقرر، جو اپنے سیاسی فہم کو عوام تک پہنچا کر ان کی رائے سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی افراد معاشرتی بیداری کے نمائندہ ہوتے ہیں، جو ظلم، نا انصافی اور جبر کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور عوامی شعور کو جلا بخشتے ہیں۔ دوسری طرف ادب میں بھی سیاسی شعور اپنے مختلف روپوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی ناول نگار اپنے کرداروں کے ذریعے سیاسی فضا کو اجاگر کرتا ہے، کوئی افسانہ نگار اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں سماجی حقائق کو بیان کرتا ہے اور کوئی غیر افسانوی نثر کے ذریعے اپنی فکری وابستگیوں کا اظہار کرتا ہے۔ یہ سب ادبی صورتیں دراصل سیاسی شعور کی ہی توسیع ہیں جو عوامی سطح پر اجتماعی آگہی پیدا کرتی ہیں۔

"سیاسی شعور اور سمجھداری ایک آلہ اور مقصد ہے۔ ایک آلے کے طور پر سیاسی شعور ہمیں تنقیدی جانچ پڑتال کے ساتھ طاقت کو وسعت کے ساتھ ابھارتا ہے۔ ایک مقصد کے طور پر سیاسی شعور ہمیں ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مستحکم اور باشعور شہری کی حیثیت سے جو طاقت کے استعمال کے لیے ضروری ہے۔" (۱۷)

سیاسی شعور محض اقتدار کے حصول یا حکمرانی کی خواہش کا نام نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد عوامی مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کے لیے مؤثر لائحہ عمل تجویز کرنا ہے۔ ایک باشعور قوم وہی ہوتی ہے جو اجتماعی بھلائی، انسان دوستی اور عدل و مساوات پر یقین رکھتی ہے۔ سیاسی شعور انسان کو سکھاتا ہے کہ ظلم و زیادتی کے خلاف کھڑا ہونا، انصاف کے لیے آواز بلند کرنا، اور معاشرتی اتحاد کو فروغ دینا ہی اصل سیاست ہے۔ یہی شعور انسان کو وقت کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ رہنے، معاشرتی ضروریات کو سمجھنے، اور ان کے مطابق عمل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یوں سیاسی شعور صرف فکری بیداری نہیں بلکہ ایک فعال سماجی قوت ہے جو معاشرے میں انصاف، ہمدردی اور اجتماعی شعور کے فروغ کا ذریعہ بنتی ہے۔

سیاسی شعور کے متعلق ڈاکٹر کامران کاظمی رقمطراز ہیں:

"سیاسی شعور فن کار کو اپنی زندگی، ماحول اور مطالعہ سے حاصل ہو گا۔ سیاسی شعور کی چٹنگی میں ماحول کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ماحول اچانک فضا میں نمودار نہیں ہوتا بلکہ اس کے ماضی میں ایک تدریجی عمل موجود ہوتا ہے۔" (۱۸)

سیاسی شعور کسی فرد یا فن کار میں اچانک پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ وقت، تجربے اور مشاہدے کے تدریجی عمل سے جنم لیتا ہے۔ فن کار اپنی زندگی کے نشیب و فراز، اپنے گرد و پیش کے حالات اور معاشرتی تغیرات سے جو کچھ سیکھتا ہے، وہی اس کے سیاسی شعور کی بنیاد بنتا ہے۔ ماحول جس میں وہ جیتا اور سوچتا ہے اس کی فکری تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

یہ ماحول دراصل ماضی کی ایک مسلسل جدوجہد، تاریخی تجربات اور اجتماعی شعور کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی عوامل فن کار کے ذہن میں سیاسی آگہی کی وہ چنگاری بھڑکاتے ہیں جو بعد میں اس کے فن کے ذریعے عوامی شعور میں منتقل ہوتی ہے۔ اس لیے سیاسی شعور نہ صرف فرد کی ذہنی پختگی کا مظہر ہے بلکہ یہ اس کے عہد کی فکری نمائندگی بھی کرتا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی شعور وہ تخلیقی روشنی ہے جو ماضی کے تجربات، حال کے مشاہدات اور مستقبل کی امیدوں کو ایک فکری تسلسل میں جوڑتی ہے۔

مہندر سنگھ بیدی: تعارف

کنور مہندر سنگھ بیدی اردو کے نمایاں شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۹ مارچ ۱۹۰۹ء کو منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں ہوئی جو اس وقت برصغیر کا ایک اہم علاقہ تھا۔ بیدی کے والد کا نام بابا ہر وٹ سنگھ بیدی تھا۔ وہ اپنی جائیداد کی دیکھ بھال ساہیوال میں ہی رہ کر کرتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی اسی خطے سے تھا۔ ان کی جائیدادیں، رہائش اور خاندانی پس منظر سب اسی سرزمین سے وابستہ تھے۔ تاہم تقسیم ہند کے موقع پر انھیں اپنے آبائی علاقے اور اثاثے سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی اور وہ ہندوستان چلے گئے۔ مہندر سنگھ بیدی کے والد اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے لیکن ان سب میں ہونہار بھی تھے۔ پھر بھی وہ پرائمری تک ہی تعلیم حاصل کر سکے لیکن انھوں نے اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔

مہندر سنگھ بیدی نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے گھر سے حاصل کی۔ جب پانچ برس کی عمر ہوئی تو منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کے سرکاری ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ بعد ازاں ان کا تعلیمی سلسلہ چیفس کالج لاہور تک جا پہنچا جہاں وہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک زیر تعلیم رہے۔ اس کے بعد انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۹ء تک وہاں علم حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے تاریخ اور فارسی کے مضامین کے ساتھ بی اے کیا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد مہندر سنگھ بیدی نے آئی سی ایس کے امتحان میں حصہ لیا مگر کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا اور ان کی پہلی تقرری بطور ایکسٹرنل سسٹنٹ کمشنر

لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں ہوئی۔ وہ ۱۹۳۴ء تک وہاں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۵ء کے آخر میں ان کا تبادلہ بحیثیت فرسٹ کلاس مجسٹریٹ رہتک میں ہوا۔ بعد ازاں انھوں نے جالندھر، گواڑ گاؤں، ملتان، جہلم، کانگڑا اور دہلی جیسے مختلف علاقوں میں بھی سرکاری فرائض انجام دیے۔ ملازمت کے دوران انھوں نے متعدد محکمانہ امتحانات بھی کامیابی سے پاس کیے۔ بالآخر ۱۹۶۷ء میں وہ محکمہ پنچایت کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

مہندر سنگھ بیدی کے تین بھائی تھے۔ سب سے بڑے ٹکا جگجیت سنگھ بیدی جو کہ وکالت کے پیشے سے منسوب تھے اور پنجاب ہائی کورٹ کے جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد کنور مہندر سنگھ بیدی کا نمبر تھا۔ تیسرے نمبر پر راجندر سنگھ بیدی اور سب سے چھوٹے بھائی کنور سریندر سنگھ بیدی تھے۔ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنی آپ بیتی "یادوں کا جشن" میں یوں کیا ہے:

"بہن کی محبت کو ہم عمر بھر ترستے رہے۔" (۱۹)

مہندر سنگھ بیدی اپنے بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ بڑے چھوٹوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ طبیعت میں یہ محبت اور اپنائیت انھیں ورثے میں ملی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پہلو ان کی شخصیت کی بڑی خوبی بن کر سامنے آئی۔ ان کے حسن اخلاق اور انسان دوستی پر نارنگ ساقی نے اپنی کتاب میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس میں بیدی صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کی شرافتِ کردار کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

"کچھ لوگ بڑے گھر میں پیدا ہوتے ہیں اور کچھ اپنی کوشش اور کاوش سے بڑے بنتے ہیں اور کچھ لوگ بہ وجہ بڑا بنادیتے ہیں۔ کنور صاحب بڑے گھر میں ضرور پیدا ہوئے مگر وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں سے بڑے آدمی بنے۔ لوگوں نے انھیں بڑا آدمی نہیں بنایا بلکہ ان کے بڑا ہونے کا ہمیشہ اعتراف کیا۔" (۲۰)

ملازمت سے ایک سال پہلے مہندر سنگھ بیدی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ لائل پور کے قیام کے دوران ان کی بیٹی کی پیدائش ہوئی جس کا نام بھوپندر رکھا گیا۔ ۱۹۳۷ء کے اوائل میں ان کے بیٹے کرم جیت سنگھ اور پھر ۱۹۳۹ء میں ان کے دوسرے بیٹے ویرندر سنگھ کی پیدائش ہوئی۔ اپنی ملازمتی زندگی میں وہ کسی ایک شہر تک محدود نہیں رہے بلکہ کچھ ہی وقت بعد ان کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب اور ہر جگہ، علاقے کے لوگ ان کے اسیر تھے۔

ان کی شخصیت انسان دوستی اور نرم دلی کا حسین امتزاج تھی۔ مذہباً سکھ ہونے کے باوجود وہ تمام مذاہب کے ماننے والوں سے محبت رکھتے اور ان کی مدد کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کی سوچ میں ذات پات، فرقہ بندی یا مذہبی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ انسانیت کو سب سے مقدم سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں بھی وہ تعینات رہے وہاں کے لوگوں کے دل ان سے وابستہ ہو گئے اور سب یہی چاہتے تھے کہ وہ ہمیشہ وہیں رہیں۔

مہندر سنگھ بیدی کو بچپن ہی سے اردو زبان اور شعر و ادب سے گہرا شغف تھا۔ وہ اپنی مصروف ملازمت کے باوجود ادب سے وابستہ رہے اور شاعری کو اپنے احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ یہی لگن اور فکری وابستگی انھیں اردو ادب میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ آج وہ بیسویں صدی کے ان نمایاں شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو شاعری کو فکری وسعت اور تہذیبی تنوع بخشا۔

ان کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ

"کچھ لوگ بڑے ہوتے ہیں لیکن شاعر برے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ شاعر بڑے ہوتے ہیں لیکن انسان برے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں اور جو شاذ ہوتے ہیں کہ شاعر بھی اچھے ہوتے ہیں اور انسان بھی اچھے ہوتے ہیں۔ ایسے 'شاعر' انسان جنھیں دیکھ کر محبت کی مہک آنے لگتی ہے اور خلوص کی کلی نسیم سحر سے کھل اٹھتی ہے اور ساری فضا موتیا چنبیلی اور رات کی رانی کی خوشبو سے مہکنے لگتی ہے۔ برصغیر کے حوالے سے اگر ایسے لوگوں کی فہرست بنائی جائے تو میرا خیال ہے کہ فہرست بنانے والے کو خاصی دشواری پیش آئے گی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس فہرست میں بلکہ سرفہرست جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا نام نامی ضرور شامل ہو گا اور نہ صرف شامل ہو گا بلکہ ہر کس نام اس نام پر صدق دل سے اتفاق بھی کرے گا۔" (۲۱)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نہ صرف اپنی شاعری میں سادگی، محبت اور وسیع النظری کا پیکر تھے بلکہ اپنی روزمرہ زندگی میں بھی انہی اوصاف کے مظہر نظر آتے تھے۔ بیدی صاحب کی زندگی صرف شاعری تک محدود نہیں تھی وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ شکار، کھیل اور مختلف مشاغل میں دلچسپی رکھتے تھے مگر ان سب کے ساتھ ان کا ادبی ذوق کبھی ماند نہ پڑا۔ ملازمت کے باوجود وہ ادب اور شاعری سے مسلسل وابستہ رہے۔ مشاعروں کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور نئی نسل کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔

مہندر سنگھ بیدی کے متعلق جوش ملیح آبادی کی رائے:

"میں بڑی دیانتداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ دنیا کے دو پاؤں پر چلنے والوں اربوں درندوں کے درمیان جن کو دھوکے سے آدمی سمجھا جاتا ہے سوچنے لگتا ہوں کہ اس ہولناک ماحول میں بیدی صاحب کا سا انسان پیدا کیوں کر ہو گیا، ہو نہ ہو یہ روزگار کا ایک عظیم اعجاز ہے۔ ان کا کاسہ سرا اسی قدر موزوں ہے کہ تاج انسانیت اس پر ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے نہ ڈھیلا ہوتا ہے نہ تنگ۔" (۲۲)

وہ نہایت شفیق انسان تھے اور خلوص و محبت کا پیکر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر مذہب کے لوگ انہیں بے حد پسند کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت جب دہلی کی حالت ابتر ہو گئی کوئی مسلمان وہاں رہنے کو تیار نہ تھا تو پنڈت نہرو کو اس بات کی فکر تھی کہ ایسے حالات میں مسلمانوں کا دہلی چھوڑ کے جانا صحیح نہیں ہے۔ اس معاملے کو حل کرنے کے لیے انھوں نے ایک جلسہ منعقد کروایا جس میں مسلمانوں سے انھوں نے بات کی کہ وہ دہلی چھوڑ کر نہ جائیں جس کے جواب میں مسلمانوں نے کہا کہ ہمارے آباؤ اجداد یہاں دفن ہیں ہمارے لیے اس علاقے کو چھوڑ کر جانا آسان نہیں ہے لیکن حالات ایسے ہیں کہ ہمیں ہجرت کرنی پڑ رہی ہے۔ اس جلسے میں مسلمانوں نے اپنے کچھ مطالبات ان کے سامنے رکھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی کو پنجاب سے واپس بلایا جائے اور ان کو دہلی کا سٹی مجسٹریٹ بنایا جائے اور دہلی کا مکمل نظام ان کے حوالے کیا جائے۔ ان کے یہ مطالبات مان لیے گئے اور مہندر سنگھ کے دہلی آتے ساتھ حالات یکسر مختلف ہو گئے۔ مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت ایسی تھی کہ ان سے ہر مذہب، ہر طبقے اور ہر ذات کا انسان محبت رکھتا تھا اور وہ ہر ایک کی قدر بھی کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ معاملات کتنے ہی سنگین ہوں ان کے ہوتے ہوئے حالات انتہائی پر امن ہو جاتے تھے۔ (۲۳)

مہندر سنگھ بیدی سحر کو اردو زبان سے گہری محبت تھی، وہ اس زبان کو صرف اظہار خیال کا وسیلہ نہیں بلکہ اپنے دل کی آواز سمجھتے تھے۔ ان کی اردو سے وابستگی محض ایک رسمی تعلق نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایسی دلی وابستگی تھی جو بچپن سے ان کے اندر پروان چڑھی۔ اپنی خود نوشت میں بھی بیدی صاحب نے اس محبت کا ذکر کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ اردو ان کے لیے محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک جذبہ اور ایک تہذیبی رشتہ ہے جس نے ان کی سوچ اور شخصیت کو نکھارا۔ ان کے اس شوق کو جلا بخشنے میں ان کے استاد کا بھی کردار تھا جو اسکول کے زمانے میں انھیں اردو پڑھاتے تھے۔ وہ استاد ہی کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ بیدی صاحب کے دل میں اردو کی محبت نے جڑ پکڑ لی اور یہ محبت عمر بھر ان کے ساتھ رہی۔ ان کی طبیعت میں شیرینی، گفتگو میں

مٹھاس اور اندازِ بیان میں وہ نرمی پائی جاتی تھی جو اردو کے مزاج کا خاصہ ہے۔ اس بارے میں نارنگ ساقی لکھتے ہیں:

"اسکول میں مولوی عبد المجید صاحب اردو پڑھایا کرتے تھے۔ ان کی شفقت اور محبت نے کنور صاحب کو بہت متاثر کیا اس طرح اردو پڑھنے کا شوق اسی اسکول میں پیدا ہوا۔ اسکول میں درس حاصل کرتے ہوئے بیدی صاحب نے ذوق، غالب، آتش، میر، سودا اور دیگر شعرا کا مطالعہ کر لیا تھا۔ تاہم ان کے کلام کے اثرات ان کے ذہن پر مرتسم رہے اور ان کی شاعری کو تقویت عطا کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوئے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی بھی اسکول کے زمانے سے ان کے اندر پیدا ہوئی۔" (۲۴)

اردو سے یہ قلبی تعلق آگے چل کر ان کی شاعری کا محرک بنا اور وہ اردو دنیا میں سحر کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے پہچان بنائی بلکہ اپنے دور کے نوجوان شعراء کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ بن گئے۔ اندرونِ ملک ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی انھیں مشاعروں میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ وہ جہاں جاتے وہاں اردو کی خوشبو بکھیر دیتے۔ وہ محفلوں کو جاندار بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی نظامت شگفتگی، حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کا حسین امتزاج ہوتی تھی۔ جب وہ کلام سناتے تو سامعین ہمہ تن گوش رہتے اور محفل کا ماحول ذوق و شوق سے بھر جاتا۔ وہ محض سنجیدہ شاعر نہیں بلکہ مزاحیہ اور دلنشین گفتگو کے بھی ماہر تھے۔

انھوں نے عشق و محبت کے روایتی مضامین سے آگے بڑھ کر قومی یکجہتی، انسان دوستی اور رواداری کو اپنا موضوع بنایا۔ وہ اس خیال کے حامی تھے کہ ادب کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ قوم کے باہمی رشتوں کو مضبوط بنانا ہے۔ ان کی شاعری میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امن، دوستی اور محبت کا جذبہ واضح نظر آتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت وہ مشاعروں میں دونوں ملکوں کے شعرا کو مدعو کرتے تاکہ شاعری کے ذریعے برصغیر میں بھائی چارے کا پیغام عام ہو۔ ان کی خود نوشت کا انتساب بھی پاک و ہند دوستی کے نام ہے جو ان کے وسیع اور فراخ دلانہ سوچ کی علامت ہے۔

مہندر سنگھ بیدی کے ہم عصر شعرا میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور جاں نثار اختر جیسے بڑے نام شامل ہیں مگر بیدی صاحب نے اپنی انفرادیت ہمیشہ برقرار رکھی۔ انھوں نے غزل، نظم، مرثیہ، قطعہ اور رباعی ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں اپنی خلوص بھری فکر کا رنگ بھرا۔ ان کا اسلوب بناوٹ سے پاک، سادہ مگر گہرا تھا۔ وہ فی البدیہہ شعر کہنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کا پہلا مجموعہ

طلوعِ سحر کے نام سے شائع ہوا جبکہ بعد میں انوارِ سحر اور تیر و نشتر جیسے مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے۔ بعد ازاں ۱۹۹۲ء میں نارنگ ساقی نے ان کا مکمل کلام جمع کر کے کلیاتِ سحر کے نام سے شائع کیا۔

مرثیہ نگاری میں بھی بیدی صاحب نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے نہ صرف جنگِ آزادی اور قومی رہنماؤں پر مرثیہ لکھے بلکہ مذہبی موضوعات پر بھی گہرے عقیدت مندانہ اشعار کہے۔ ان کا مشہور مرثیہ مرثیہ پنڈت نہرو ان کے ادبی مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔ انھوں نے حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی شان میں بھی عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ ان کے اشعار میں وحدتِ انسانی کا عقیدہ اور روحانی یکجہتی کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔

نعتیہ شاعری کے حوالے سے جب دوسرے مسلک کے شعراء کا ذکر آتا ہے تو مہندر سنگھ بیدی سحر کا نام نمایاں طور پر لیا جاتا ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ کی سیرت، اخلاق اور شفقت سے بے حد متاثر تھے۔ ان کے دل میں رسولِ اکرم ﷺ کی محبت موجزن تھی جس کا اظہار انھوں نے نعتیہ اشعار میں خلوص و عقیدت کے ساتھ کیا۔ ان کے کلام میں نعتیہ اشعار کی کثرت اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا قلب عشقِ رسول ﷺ سے منور تھا۔ بیدی صاحب کی شاعری انسانیت، محبت، رواداری اور اخوت کا ایسا گلدستہ ہے جو برصغیر کی مشترکہ تہذیب کی خوشبو کو آج بھی تازہ رکھے ہوئے ہے۔ ان کی ایک مشہور نعت کے کچھ اشعار ہیں:

ہم کسی دین سے ہوں، صاحبِ کردار تو ہیں

ہم ثنا خوانِ شہِ حیدر کرار تو ہیں

نام لیوا ہیں محمد کے پرستار تو ہیں

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چار تو نہیں

صرف مسلم کا محمد پہ اجارا تو نہیں (۲۵)

ان اشعار سے ہر ذی شعور انسان یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان کو نبی پاک ﷺ سے حقیقی طور پر بے حد محبت تھی۔ سحر صاحب کی محبتِ انسانیت کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ مدینہ سے بھی گہری عقیدت رکھتے تھے اور شہرِ نبی کے متعلق بھی اشعار لکھے۔

نکلنے کو ہیں دل کے ارماں سحر سب

وہ دیکھو مدینہ قریب آ رہا ہے (۲۶)

مہندر سنگھ بیدی کے دل میں مدینہ کا تصور اتنا گہرا اور پاکیزہ ہے کہ وہ اسے صرف خواب یا خیال نہیں بلکہ حقیقت کے قریب محسوس کرتے ہیں۔ یہ فقرہ عقیدت کے عروج اور روحانی سرشاری کا مظہر ہے۔ بیدی سحر کے دل میں نبی کریم ﷺ اور ان کے شہر سے جو محبت تھی وہ کسی رسمی عقیدت کی پیداوار نہیں بلکہ قلبی لگاؤ اور روحانی وابستگی کا اظہار ہے۔

مہندر سنگھ بیدی سحر مذہبی اختلافات سے بالاتر ہو کر نبی پاک ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے عشق میں سرشار تھے۔ وہ مدینہ کو صرف ایک شہر نہیں بلکہ امن، محبت اور رحمت کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کے لیے مدینہ کا تصور اس نورانی فضا کی مانند تھا جس میں انسان اپنی روح کو پاکیزگی اور سکون کے قریب پاتا ہے۔ یوں ان کے کلام میں محبتِ رسول ﷺ ایک دل نشین روحانی جذبے کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

مہندر سنگھ بیدی نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز شاعری سے کیا۔ ان کی ابتدائی ادبی کاوشیں شعری اظہار پر مبنی تھیں جن میں جذبات کی لطافت، انسانی رشتوں کی گہرائی اور معاشرتی مشاہدے کی شدت نمایاں تھی۔ وہ محض شاعر نہیں بلکہ ایک گہرے وجدان رکھنے والے حساس فنکار تھے۔ ان کی شاعری نے ہی ان کے تخلیقی شعور کو وہ وسعت دی جس نے بعد میں ان کی نثر کو بھی گہرائی عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اصل شہرت اگرچہ شاعری سے ہوئی مگر نثر نگاری میں بھی انھوں نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ ان کی آپ بیتی "یادوں کا جشن" اسی تخلیقی سفر کا تسلسل ہے جس میں ان کی پوری زندگی کے مختلف ادوار کی جھلک ملتی ہے۔ اس کتاب میں بیدی نے اپنے حالاتِ زندگی، تعلیم، ملازمت، تقسیم ہند کے تجربات اور مختلف علاقوں کے مشاہدات کو اس سادگی اور خلوص سے بیان کیا ہے کہ قاری ان کے ساتھ ایک سفر پر نکل پڑتا ہے۔ ان کی نثر میں زندگی کی حقیقت، یادوں کی چمک اور مشاہدے کی گرمی سب کچھ یکجا ملتا ہے۔

کنور مہندر سنگھ ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ فلم ساز بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے پانچ فلمیں بنائی ہیں ان میں سے تین پنجابی زبان میں اور دو اردو زبان میں ہیں۔ اسی باعث ان کو فلمی دنیا کے لوگوں سے ملنے کا اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کا دلیپ کمار اور اوم پرکاش سے گہرا یارانہ تھا۔

مہندر سنگھ بیدی اخلاق اور فن دونوں اعتبار سے اعلیٰ پائے کی شخصیت تھے۔ اردو زبان اور اردو شاعری سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور طویل مدت تک مشاعروں کی نظامت بھی کرتے رہے اس طرح وہ مشاعروں کی خاص شناخت بنے رہے۔ اسی بدولت بیدی صاحب پاکستان اور ہندوستان دونوں میں یکساں طور پر مقبول رہے۔ ان سارے معاملات کے ساتھ وہ اپنی ملازمت میں بھی بہت نمایاں کردار ادا کرتے رہے ہیں اور انتظامی معاملات کو انھوں نے احسن طریقے سے نبھایا ہے۔

اس کے متعلق اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں کہ:

"میں اپنے معبود کو حاضر و ناظر جان کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی عدالتی زندگی میں جان بوجھ کر کبھی کسی سے ناانصافی نہیں کی بلکہ سہواً اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو ہو گئی ہو۔ سائل بھی اس بات کو جانتے تھے اور ان کی کوشش یہ ہوا کرتی تھی کہ ان کا مقدمہ میری عدالت میں منتقل ہو جائے۔" (۲۷)

ایسی بات پورے وثوق اور اعتماد سے وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے اپنی ذمہ داری کو دیانت داری، حوصلے اور خلوص کے ساتھ نبھایا ہو۔ مہندر سنگھ بیدی کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہمیشہ ہر معاملے کو عقل و تدبیر، صبر و برداشت اور امن و آشتی کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کی۔ وہ فطری طور پر ایک متوازن اور منصف مزاج انسان تھے، اس لیے نظام زندگی کو درست خطوط پر استوار کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ یہی صلاحیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے ہنگامہ خیز دور میں حالات کس قدر سنگین تھے، اس کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جس نے اس الم ناک دور کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو یا تاریخ کے صفحات سے اس کی جھلک محسوس کی ہو۔ وہ ایک ایسا وقت تھا جب انسانیت لہو میں نہا گئی تھی، اور فرقہ واریت و ذات پات کی آگ نے پورے معاشرے کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ لوگ معمولی بات پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے، گلی کوچوں میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا، اور خوف و دہشت نے زندگی کو مفلوج کر دیا تھا۔ ایسے نازک حالات میں بیدی صاحب کو دہلی کا سٹی مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ یہ تقرری دراصل ان پر حکام بالا کے مکمل اعتماد کی علامت تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسے انتشار زدہ ماحول میں امن و امان صرف وہی شخص قائم رکھ سکتا ہے جو خود امن کا علمبردار، تحمل و بردباری کا پیکر اور انسانیت سے سچی محبت رکھنے والا ہو۔ بیدی صاحب نے ان پر خطر حالات میں جس دانش مندی، توازن اور عدل و انصاف سے اپنے فرائض انجام دیے، وہ ان کی شخصیت کے بلند اخلاقی معیار اور عملی بصیرت کا ثبوت ہے۔

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی سے یہ بات بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف ایک حساس شاعر اور باشعور ادیب تھے بلکہ ایک عملی انسان بھی تھے جنہوں نے اپنے عہد کے نازک ترین حالات میں فراست اور تدبیر سے کام لیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد جب برصغیر نے غلامی کی طویل رات سے نجات حاصل کی تو آزادی کے ساتھ ہی ملکی تقسیم کی صورت میں ایک المیہ بھی سامنے آیا۔ اس تقسیم نے پورے ہندوستان کو لہو میں نہلا دیا۔ ایسے پُر آشوب اور خطرناک حالات میں جب ہر سمت بد امنی اور خوف کا عالم تھا، کنور مہندر سنگھ بیدی کو دوبارہ دہلی کے سٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اس عہدے پر تقرری اس بات کا ثبوت تھی کہ حکام بالا ان کی دانش مندی، تدبیر، اور امن پسندی پر غیر متزلزل اعتماد رکھتے تھے۔

دہلی جیسے حساس شہر میں امن کی بحالی ایک ناممکن کام دکھائی دیتا تھا، مگر بیدی صاحب نے اپنی خلوص نیت، فراست اور عملی بصیرت سے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ انہوں نے سیاسی اقدامات کے بجائے سماجی اور ثقافتی ذرائع سے لوگوں کے دل جیتنے کی کوشش کی۔ ان کا یقین تھا کہ امن و آشتی کی فضا اس وقت قائم ہوتی ہے جب عوام کے دلوں میں میل ملاپ، محبت اور مشترکہ خوشی کے جذبات پیدا ہوں۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے مشاعروں، ادبی محفلوں، اور تفریحی اجتماعات کو فروغ دیا۔ ان کے نزدیک یہ پروگرام تخریب کاری کے بجائے تعمیرِ معاشرت کا ذریعہ تھے کیونکہ بیدی صاحب کا عقیدہ تھا کہ جب لوگ تفریح اور ادب میں دلچسپی لیتے ہیں تو ان کے دلوں سے نفرت کے کانٹے خود بخود نکل جاتے ہیں۔ انہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ خنجر زنی کی وارداتیں ختم ہوئیں اور شہر دہلی میں امن بحال ہوا۔

اس بارے میں نارنگ ساتی اپنی کتاب میں قلم طراز ہیں:

"کنور صاحب کی دہلی میں پہلی تقرری کا زمانہ اگر دہلی کا دور بہار کہا جائے تو دوسری تقرری کا زمانہ دور خزاں سے کم نہ تھا۔ گویا کنور صاحب نے دہلی کے اُتار چڑھاؤ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دہلی والوں کے ساتھ وہ مسکرائے، ہنسے اور روئے بھی۔ انہوں نے دہلی کے ہندو مسلمان اتحاد و ملی جلی محفلوں، مشترکہ نشت و برخاست، دعوتوں اور ضیافتوں کو بھی دیکھا۔" (۲۸)

مہندر سنگھ بیدی کی یہ سوچ اس بات کا مظہر ہے کہ ادب اور فنونِ لطیفہ انسانی نفسیات کو نرمی، محبت اور برداشت کی راہوں پر گامزن کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ مشاعرے، کھیل تماشے اور میلوں کے انعقاد سے انسان کا ذہن مثبت سرگرمیوں کی طرف مائل ہوتا ہے اور فرقہ وارانہ منافرت کے زخم مندمل ہونے لگتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی رہائش گاہ پر نہ صرف مشاعرے منعقد کیے بلکہ مرغوں، تیتروں

کے مقابلے اور مینڈھوں کی لڑائیوں جیسے عوامی تفریحی مشاغل کا اہتمام بھی کیا، تاکہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب ایک جگہ جمع ہو کر انسانیت کے رشتے کو دوبارہ جوڑ سکیں۔ بیدی صاحب کا یہ عمل محض تفریح نہیں بلکہ ایک عملی پیغام تھا کہ محبت، اتحاد اور رواداری ہی انسانیت کا اصل چہرہ ہے۔

مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت کے تمام پہلو شاعری، نثر، انتظامی ذمہ داریاں اور انسان دوستی مل کر ایک ایسی ہمہ جہت تصویر پیش کرتے ہیں جس میں خلوص، محبت اور امن کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ صرف ایک کامیاب افسر یا معروف شاعر نہیں بلکہ انسانیت کے علمبردار تھے۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اتفاق و یگانگت کو فروغ دیا، مذہب یا ذات کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسان ہونے کی بنیاد پر محبت بانٹی۔ یہی خوبی انہیں اپنے ہم عصروں میں منفرد بناتی ہے۔

مہندر سنگھ بیدی سحر صرف دہلی کے نہیں بلکہ پورے برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ ترقی اردو بورڈ کے نائب صدر رہے، دہلی اردو اکیڈمی کے بھی نائب صدر تھے اور غالب اکیڈمی کے فعال رکن کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ اردو زبان کے فروغ اور ثقافتی ہم آہنگی کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اپنی آخری عمر میں وہ کینسر کے موزی مرض میں مبتلا ہو گئے مگر بیماری نے بھی ان کے عزم اور حوصلے کو متزلزل نہ کیا۔ بالآخر ۱۷ جولائی ۱۹۹۲ء کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی زندگی علم، محبت، امن، اور انسانیت کی خدمت سے عبارت تھی۔ وہ بلاشبہ ایک عظیم شاعر، باکمال منتظم اور سب سے بڑھ کر ایک اعلیٰ انسان تھے۔

آپ بیتی یادوں کا جشن: تعارف

مہندر سنگھ بیدی سحر کی آپ بیتی "یادوں کا جشن" پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی، جو نہ صرف ان کی ادبی زندگی کا اہم سنگ میل ثابت ہوئی بلکہ اردو نثر میں آپ بیتی کے فن کو بھی ایک نیا رنگ عطا کیا۔ بیدی سحر بیسویں صدی کے ممتاز اردو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں مگر اس آپ بیتی کی بدولت وہ ایک کامیاب نثر نگار کے طور پر بھی پہچانے گئے۔ ان کی نثر میں وہی روانی، شوخی اور دلکشی نظر آتی ہے جو ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔

اس آپ بیتی میں مہندر سنگھ بیدی نے اپنی زندگی کے مختلف پہلو نہایت سلیقے اور خلوص کے ساتھ قلم بند کیے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں وہ اپنی پیدائش، خاندانی پس منظر، حسب و نسب اور تعلیم و تربیت کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آبائی علاقے، گھر کے ماحول، والدین کی تربیت اور بچپن کی شراکتوں تک کو

نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کی گفتگو میں کہیں سادگی جھلکتی ہے کہیں مزاح، اور کہیں زندگی کے تلخ تجربوں کی گہرائی۔

بیدی سحر نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ملازمت میں گزارا۔ چنانچہ "یادوں کا جشن" میں ان کی سرکاری خدمات، تبادلے، مختلف علاقوں میں تقرریاں اور وہاں کے حالات نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ہر جگہ کے مناظر، لوگوں کے مزاج، ثقافت اور روزمرہ زندگی کے رنگ ان کے قلم سے یوں جھلکتے ہیں جیسے قاری خود ان کے ساتھ سفر کر رہا ہو۔ ان کی تحریر میں نہ صرف تاریخی مشاہدہ جھلکتا ہے بلکہ انسان دوستی اور خدمتِ خلق کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔

مہندر سنگھ بیدی سحر تقسیم ہند کے چشم دید گواہ تھے۔ انھوں نے اس سانحے کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ دل کی گہرائیوں سے محسوس بھی کیا۔ "یادوں کا جشن" میں انھوں نے تقسیم کے دوران پیش آنے والی تباہ کاریوں، قتل و غارت، ہجرتوں، انسانی المیوں اور مذہبی منافرت کے المناک مناظر کو سادہ مگر مؤثر انداز میں قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ کس طرح انھیں بھی اپنا علاقہ، اپنا گھر اور اپنی سرزمین چھوڑنی پڑی، اور اس دوران جو تکالیف، جدائیاں اور قربانیاں پیش آئیں وہ سب اس آپ بیتی کا حصہ ہیں۔

کتاب میں بیدی سحر کی کثیر الجہتی شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہیں۔ کہیں وہ شاعر ہیں، کہیں شکاری، کہیں پہلوان، تو کہیں ایک حساس انسان۔ انھوں نے اپنے اساتذہ، شاگردوں اور احباب کا بھی نہایت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کے دوستوں اور تعلق داروں کے اخلاق، عادات و اطوار اور دلچسپ خصوصیات کو ایسی حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ قاری ہر کردار کو گویا اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

"یادوں کا جشن" کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ بیدی سحر نے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا یا جیا، اسے بغیر کسی تصنع یا بناوٹ کے، خالص سچائی کے ساتھ بیان کیا۔ ان کی تحریر میں تاریخ کی صداقت بھی ہے، جذبات کی شدت بھی اور بیان کی سادگی بھی۔ کبھی ان کے جملوں میں ہلکا سا مزاح قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے اور کبھی تقسیم کے زخمِ دل کو گہرے دکھ سے بھر دیتے ہیں۔ یوں "یادوں کا جشن" صرف ایک فرد کی سوانح نہیں بلکہ ایک عہد، ایک قوم اور ایک تہذیب کی تاریخ ہے جس میں ماضی کے دکھ، حال کی بصیرت اور مستقبل کی تمنا ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔

نریندر لو تھڑ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"تاریخ کے طالب علم، سوشل ورکر، افسر اور سرکاری نوکر، ادیب اور شاعر ہر قسم کے لوگ اس سے محفوظ اور مستفید ہو سکتے ہیں۔" (۲۹)

مہندر سنگھ بیدی سحر کی خود نوشت "یادوں کا جشن" محض ان کی ذاتی زندگی کا آئینہ نہیں بلکہ برصغیر کی تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی فضا کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہے۔ اس آپ بیتی میں بیدی سحر نے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی روح کو بھی گرفت میں لیا ہے۔ خاص طور پر دہلی جو ان کی زندگی کے بیشتر حصے کا مرکز رہا ان حالات و واقعات کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کی دہلی کو دو مختلف زاویوں سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ ایک طرف وہ پرانی دہلی کی تہذیبی نرمی، ادبی نزاکت، اور مشترکہ ثقافت کی گواہی دیتے ہیں، تو دوسری طرف تقسیم کے بعد کے انتشار، خوف اور بد اعتمادی کی فضا کو نہایت دردناک انداز میں پیش کرتے ہیں۔

بیدی سحر نے اپنی خود نوشت میں دہلی کے فرقہ وارانہ حالات اور ان کے سدباب کے لیے اپنی ذاتی کاوشوں اور ان لوگوں کا ذکر بھی کیا ہے جو ان کے ساتھ امن و آشتی کے قیام میں شریک رہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف نظم و نسق کے ماہر تھے بلکہ انسانیت کے بھی عاشق تھے۔ انھوں نے اس وقت کے سیاسی اور سماجی خلفشار کے باوجود صبر، تدبر اور بھائی چارے کی راہ اختیار کی اور اسی کو اپنے کردار کا حصہ بنایا۔

اسی طرح دہلی کی ادبی محفلوں، شعری نشستوں اور مشاعروں کا ذکر بھی نہایت رنگینی اور رعنائی کے ساتھ "یادوں کا جشن" میں ملتا ہے۔ بیدی سحر نے اپنے عہد کے ممتاز شعراء، ادباء، نقادوں اور اہل ذوق شخصیات کا تذکرہ دلنشیں پیرائے میں کیا ہے۔ یہ تذکرے نہ صرف اس زمانے کی ادبی فضا کا پتہ دیتے ہیں بلکہ اس بات کی بھی دلیل ہیں کہ بیدی سحر خود بھی اردو زبان و ادب کی تہذیبی روایت سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔

نریندر لو تھڑ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"یادوں کا جشن" میں بیدی صاحب کی ہمہ گیر پہلودار اور پرکشش شخصیت اپنی پوری شان اور آب و تاب کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ رئیس زادہ۔ غریب نواز، شاعر۔ ادیب نواز، افسر۔ عوام پسند، ماہر شکاری۔ جانوروں کا عاشق، اکھاڑے کا

پہلو ان - نفاس کا دلدادہ، پکا سکھ - تعصب سے پاک، ماہر انتظامیہ، سوجھ بوجھ اور حکمت عملی کا حامل - کتنی ہی صورتیں ہیں کہ عیاں ہو گئیں۔" (۳۰)

اس سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ اُس زمانے کی ادبی محفلیں کس قدر فعال، زندہ اور ذوقِ ادب سے سرشار تھیں۔ مشاعرے، نشستیں اور محفلِ سخن گویا زندگی کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جب سیاسی اور سماجی فضا انتشار کا شکار تھی اس وقت بھی اہل قلم اور اہل ذوق نے ادبی سرگرمیوں کو ماند نہیں پڑنے دیا بلکہ ادب کے چراغ کو جلانے رکھا۔ بیدی سحر نے اپنی خودنوشت میں اُس عہد کی تہذیبی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کو نہایت باریک بینی سے قلم بند کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف مشاہدہ کرنے والے نہیں بلکہ ایک حساس اور باضمیر ادیب بھی تھے۔ انھوں نے اپنے دور کے شعرا کے باہمی تعلقات اور چپقلشوں کو بھی بے تکلفی سے بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری کے درمیان ادبی رقابت کا ذکر کرتے ہوئے بیدی نے اس ماحول کی حقیقت پسندی کو نمایاں کیا ہے۔ اسی طرح ظریف دہلوی اور سید محمد جعفری کی باہمی نوک جھونک اور ادبی انا کی جھلکیاں بھی کتاب میں ملتی ہیں جو اُس عہد کی محفلوں کی رنگینی اور برجستگی کو ظاہر کرتی ہیں۔

کتاب کی زبان عام فہم، رواں اور بے تکلف ہے جس میں قاری کے لیے کوئی اجنبیت نہیں۔ بیدی سحر نے جگہ جگہ فارسی اشعار اور محاورات سے تحریر کو حسن و دلکشی عطا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ہر طبقے کے قارئین کے لیے قابلِ مطالعہ اور دل چسپ بن گئی ہے۔ بیدی سحر کی شخصیت جس شفافیت، خلوص اور سچائی کے ساتھ "یادوں کا جشن" میں ابھرتی ہے وہی تاثر ان کے بارے میں رائے دینے والوں کے بیانات سے بھی جھلکتا ہے۔ ناقدین اور معاصرین سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ بیدی سحر نے اپنی خودنوشت میں خود کو جس طرح پیش کیا وہ ان کی اصل شخصیت کا عکاس ہے۔ ان کے کردار میں دکھاوا نہیں بلکہ حقیقت کی روشنی ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھے جو شاعر بھی ہے، منتظم بھی اور سب سے بڑھ کر ایک سچا انسان، جس کی زندگی اور تحریر دونوں میں انسان دوستی اور سچائی کا رنگ نمایاں ہے۔

زیرِ دلو تھڑ یادوں کا جشن کی خاصیت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ ایک شخص کی سوانح حیات نہیں، ایک عہد کی تاریخ ہے۔ مصنف اگر کوئی سیاستداں یا تاریخ داں ہوتا تو اس کتاب کو غلامی سے آزادی تک، یا پرکاش ٹنڈن کی انگریزی سوانح 'دی پنجابی سپیری' کا عنوان دے سکتا تھا۔ لیکن یہ حساس شاعر کی زندگی کا سفر نامہ ہے۔ جو بیسیویں صدی کے دو تہائی حصے کا احاطہ کرتا ہے۔ اس عرصے میں بیدی صاحب کی بزمِ آراستہ

رہی۔ اس بزم میں رند بلانوش اور زاہد خشک نے ایک ہی گھاٹ اور بیک وقت پانی اور اپنی پسند کی وہسکی پی ہے۔ ہر ورق پر ہندوپاک کی نامور سیاسی، ادبی اور سوشل ہستیاں اپنے مختلف موڈوں اور مخصوص انداز میں خراماں نظر آتی ہیں۔" (۳۱)

یہ تصنیف اگرچہ ہندوستان میں تحریر کی گئی مگر اس کا پہلا ایڈیشن پاکستان سے شائع ہوا جو خود اس بات کی علامت ہے کہ یہ کتاب دونوں ملکوں کے قارئین کے لیے یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ اس آپ بیتی کے بارے میں تقریباً ہر ناقد نے مثبت رائے دی ہے چاہے وہ بیدی سحر کی شخصیت سے متعلق ہو یا اس کے موضوعات کے بارے میں۔ بیدی سحر کی شخصیت نہایت شفاف اور غیر متنازع تھی اور یہی وصف ان کی آپ بیتی میں بھی نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے واقعات کو دیانت داری، سچائی اور خلوص کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس آپ بیتی میں بیدی سحر نے تقسیم ہند جیسے حساس موضوع کو بھی تعصب سے بالاتر ہو کر بیان کیا ہے۔ انھوں نے ماضی کے دکھوں اور حادثات کو نفرت یا الزام تراشی کے بجائے حقیقت پسندی اور انسان دوستی کے زاویے سے پیش کیا۔ یہی غیر جانب دارانہ طرز بیان اس تصنیف کو نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان میں بھی یکساں طور پر مقبول بناتا ہے۔ یہ آپ بیتی محض ایک ذاتی داستان نہیں بلکہ ایک عہد کی تہذیبی، ادبی اور انسانی قدروں کی زندہ تصویر ہے جو بیدی سحر کے فکری وقار اور اخلاقی بصیرت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

"یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ بیدی صاحب کی یہ کتاب غیر دانستہ طور پر ہندوپاکستان کی مشترکہ قدروں اور بنیادی دوستی کی مظہر بن گئی ہے کہ لکھی تو ہندوستان میں گئی اور چھپی پاکستان میں اور پڑھی جائے گی دونوں ملکوں میں۔" (۳۲)

مہندر سنگھ بیدی سحر پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں یکساں مقبول رہے۔ انھوں نے دونوں خطوں سے محبتیں سمیٹیں اور اپنے فن و شخصیت کے ذریعے ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو سرحدوں سے ماورا ہے۔ ان کی آپ بیتی ایسی ہے کہ اردو زبان سے محبت کرنے والا ہر شخص اسے ضرور پڑھنا چاہے گا، چاہے وہ پاکستان میں ہو یا ہندوستان میں۔ بیدی سحر کی خود نوشت میں عمومی طور پر تہذیب و ثقافت پر گفتگو کی گئی ہے، تاہم دہلی کے حالات اور مناظر اس میں نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیدی صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارا، اسی شہر کو مستقل مسکن بنایا اور زندگی کے آخری حصے تک وہیں مقیم رہے۔

ان کی آپ بیتی کی زبان نہایت سادہ، رواں اور سلیس ہے، جسے ہر عام و خاص قاری با آسانی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ اندازِ بیان میں سلاست، روانی اور فطری حسن نمایاں ہیں۔ وہ واقعات کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے برپا ہو۔ بیدی نے جگہ جگہ فارسی اشعار کا استعمال کیا ہے جو ان کی شاعرانہ طبیعت، ذوقِ جمال اور کلاسیکی ادب سے گہری وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔

مہندر سنگھ بیدی سحر کی یہ آپ بیتی صرف ایک فرد کی زندگی کا احوال نہیں بلکہ برصغیر کی ادبی، تہذیبی اور تاریخی روح کا آئینہ ہے۔ اس میں محبت، رواداری، سچائی اور انسان دوستی کی وہ خوشبو رچی بسی ہے جو قاری کے دل میں دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔ "یادوں کا جشن" بلاشبہ اردو خود نوشت نگاری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے جو بیدی سحر کے ادبی قد اور انسانی وقار دونوں کو نمایاں کرتا ہے۔

جوش ملیح آبادی: تعارف

جوش ملیح آبادی کا اصل نام شبیر حسن خاں تھا۔ اردو ادب کی دنیا کا وہ روشن چراغ ہیں۔ جنہوں نے اپنی زندگی کے ہر دور میں فکر و شعور کی جوت جگائی۔ وہ ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء کو اتر پردیش کے مشہور قصبے ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد یوسف زئی پٹھان تھے جو افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور یہاں کے سیاسی و سماجی نظام کا اہم حصہ بنے۔ نوابین اودھ کے دربار میں ان کے خاندان کے کئی افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ جوش کا تعلق ایک متمول اور باوقار خاندان سے تھا اسی وجہ سے ان کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی۔ بچپن ہی سے وہ خاندان کے لاڈلے تھے جس کا اثر ان کی طبیعت پر نمایاں تھا۔ ان کی شخصیت میں خودداری، تند خوئی اور بے باکی انہی ابتدائی اثرات کا نتیجہ تھی جو آگے چل کر ان کے مزاج کا مستقل حصہ بن گئی۔

جوش ملیح آبادی کو ابتدا ہی سے علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے دوران ہی انہوں نے عربی اور فارسی پر دسترس حاصل کر لی، کیونکہ اس دور میں ان زبانوں کو تعلیم کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے کا بے حد شوق تھا مگر والدین کی اجازت نہ مل سکی۔ نتیجتاً، ان کے والد نے انہیں سیتاپور بھیجا تاکہ وہاں تعلیم مکمل کر سکیں لیکن جوش کا آزاد مزاج وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ بعد ازاں وہ آگرہ گئے جہاں انہوں نے سینٹ پیٹرز کالج میں داخلہ لیا اور وہیں سے سینٹ کیمبرج کا امتحان

پاس کیا۔ یہ تعلیمی سفر اگرچہ رسمی لحاظ سے زیادہ طویل نہیں رہا لیکن اس دوران انھوں نے وہ فکری گہرائی اور ادبی شعور حاصل کیا جس نے بعد میں انہیں اردو ادب کا جوش بنا دیا۔

جوش ملیح آبادی نے عملی زندگی کا آغاز جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے کیا جہاں انہیں دارالترجمہ میں "ناظر ادب" کے طور پر مقرر کیا گیا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں علمی و ادبی فضا نہایت زرخیز تھی اور وہاں کے اہل علم و فن سے میل جول نے جوش کی فکری تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم ان کے اندر موجود آزادی فکر اور غلامی کے خلاف نفرت نے انہیں زیادہ دیر تک سرکاری پابندیوں کے اندر نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ جب انھوں نے نظام حیدرآباد کے خلاف ایک نظم کہی تو انھیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ یہ واقعہ جوش کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔

جوش ملیح آبادی نے برطرفی کے بعد صحافت کے میدان کو اپنی فکری اور تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ سب سے پہلے انھوں نے رسالہ "کلیم" کی ادارت سنبھالی جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد وہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۱ء تک "نیا ادب" اور "کلیم لکھنؤ" کے مدیر اعلیٰ رہے۔ ان کے ادبی نظریات اور انقلابی خیالات نے ان رسائل کو نئی جہت عطا کی۔ بعد ازاں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک وہ فلمی دنیا سے وابستہ رہے، جہاں انھوں نے فلموں کے لیے نغمے اور مکالمے تحریر کیے۔ اس دور نے ان کے تخیل میں رنگینی اور اظہار میں وسعت پیدا کی۔ فلمی دنیا سے علیحدگی کے بعد وہ دوبارہ ادبی صحافت کی طرف لوٹے اور دہلی سے رسالہ "آج کل" نکالنا شروع کیا جس کی ادارت انھوں نے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک نہایت کامیابی سے انجام دی۔

جوش ملیح آبادی کی اصل پہچان ان کی شاعری ہے۔ شاعری ان کے خون میں شامل تھی کیونکہ ان کے دادا، پردادا، والد اور چچا سبھی شعر و ادب سے وابستہ تھے۔ ان کے گھر میں مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں لکھنؤ اور اودھ کے مشہور شعراء شریک ہوتے تھے۔ یہی ماحول جوش کی فکری اور جمالیاتی تربیت کا سرچشمہ بنا۔ بچپن ہی سے ان کے اندر شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور انھوں نے ابتدا میں عزیز لکھنوی سے اصلاح لینا شروع کی، مگر جلد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوش کی سوچ جدید اور انقلابی تھی جبکہ عزیز لکھنوی کلاسیکی طرز کے نمائندہ استاد تھے۔ اس فکری اختلاف نے جوش کو اپنی الگ راہ بنانے پر مجبور کیا، اور وہ واقعی اردو شاعری میں ایک نئی آواز، ایک نیا لہجہ اور ایک نیا جوش لے کر سامنے آئے۔

انھوں نے شاعری نو سال کی عمر میں شروع کر دی تھی۔ اپنے فن شاعری کے متعلق تحریر کرتے ہیں

کہ

"میں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ شعر کہنا شروع کر دیا تھا یہ بات میں نے خلاف واقعہ اور غلط لکھی ہے کیونکہ یہ کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ خود سے شعر کہے شعر اصل میں کہا نہیں جاتا وہ تو اپنے کو کہلواتا ہے اس لئے صحیح طرز بیان اختیار کر کے مجھے یہ لکھنا چاہیے کہ نو برس کی عمر سے شعر نے اپنے کو مجھ سے کہلوانا شروع کر دیا تھا۔" (۳۳)

جوش ملیح آبادی اردو ادب میں ایک ایسے شاعر کے طور پر پہچانے جاتے ہیں جن کی شاعری میں فکر، احساس اور جذبہ ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں صرف الفاظ کی خوب صورتی نہیں بلکہ ایک زبردست انقلابی روح کار فرما ہے۔ وہ اپنے عہد کے مظلوموں، محکوموں اور پسے ہوئے طبقات کی آواز بن کر ابھرے۔ ان کے اندر ایک انسان دوست اور حریت پسند شاعر چھپا ہوا تھا جو غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور انسان کو اس کی حقیقی آزادی دلانے کا خواہاں تھا۔ جوش کی شاعری میں جہاں عشق و محبت کا رنگ موجود ہے وہاں انسانیت، مساوات، حریت، اخوت اور انقلاب کے نعرے بھی پوری قوت سے گونجتے ہیں۔ وہ ایک طرف ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو دوسری طرف انسان کو انسان سے محبت کرنا سکھاتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے برطانوی استعمار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ وہ غلامی کے سخت مخالف اور آزادی کے عاشق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں انگریز حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کے جذبات جا بجا نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم "آزادی کا خواب" میں وہ قوم کو خواب غفلت سے بیدار ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کی نظم "شکستِ زنداں کا خواب" اردو شاعری کی انقلابی نظموں میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ "کسان"، "وطن"، "ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب"، اور "قانونِ مشرق" جیسی نظمیں ان کی فکری وسعت اور سیاسی شعور کی مظہر ہیں۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد جوش کی شاعری میں ایک نیا رخ پیدا ہوا۔ یہاں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں "سرور و خروش"، "سموم و صبا" اور "طلوعِ فکر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے کلام میں غزل، نظم، مرثیہ، قطعات اور رباعیات سبھی اصناف موجود ہیں۔ ان کی شاعری میں جوش بیان، رعنائی الفاظ اور انقلابی پیغام تینوں چیزیں ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔

جوش ملیح آبادی کے اندر ایک بے باک اور آزاد فکری انسان بستا تھا۔ وہ مذہب کی اصل روح کو مانتے تھے مگر مذہبی ریاکاری اور بناوٹی عقائد سے سخت نفرت رکھتے تھے۔ وہ ایسے مذہب کے قائل تھے جو انسان کو انسان سے محبت اور رواداری سکھائے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں اکثر جگہوں پر مذہبی منافقت اور اخلاقی زوال کے خلاف شدید احتجاج ملتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر دین انسانیت سے جدا ہو جائے تو پھر وہ صرف رسومات کا مجموعہ رہ جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں اخلاقی اقدار، سچائی، خلوص، اور انصاف جیسے موضوعات بار بار ابھرتے ہیں۔ ان کی مشہور نظموں میں "روحِ ادب"، "شعلہٴ شبِ نیم"، "نقش و نگار، اور "فکر و نشاط" ان کی فکری گہرائی اور فنی پختگی کا بہترین ثبوت ہیں۔ اسی طرح ان کے دیگر مجموعے "جنون و حکمت"، "حرفِ حکایت" اور "آیات و نعمات" بھی اردو شاعری کے اہم سرمایہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اگرچہ جوش ملیح آبادی کی اصل پہچان ان کی شاعری ہے، تاہم ان کی نثر نگاری بھی کسی طرح کم نہیں۔ ان کی نثر میں وہی شعلہٴ بیانی، فصاحت اور انفرادیت ملتی ہے جو ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ان کے نثری سرمایے میں ادارے، مقالات، مکاتیب، مقدمے، تقاریض اور صحافتی مضامین شامل ہیں۔ ان کے خطوط میں احتشام حسین، مصطفیٰ زیدی اور ساغر نظامی کے نام مکتوبات نہایت اہمیت کے حامل ہیں جن سے ان کی فکری وسعت اور ادبی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کی نثر کا سب سے نمایاں کارنامہ ان کی آپ بیتی "یادوں کی برات" ہے، جو اردو ادب میں خود نوشت سوانح عمریوں کے باب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں جوش نے اپنی زندگی، اپنے عہد، اپنے نظریات اور اپنے مشاہدات کو نہایت بے باکی سے بیان کیا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی خود نوشت اور اس کے عنوان کے متعلق محمد ارشد لائق لکھتے ہیں:

"ان کی مشہور زمانہ خود نوشت "یادوں کی برات" بھی کسی انمول خزانہ سے کم

نہیں۔ پہلے ذرا اس ترکیب پر غور کیجیے "یادوں کی برات" کس قدر رعنائی ہے اس

ترکیب میں۔" (۳۴)

جوش ملیح آبادی نے ۱۹۵۵ء میں پاکستان کی شہریت اختیار کی۔ یہاں آکر انھوں نے بھی ادب اور زبان کی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا۔ انھوں نے ترقی اردو بورڈ کے لیے درخواست دی جو حکومت پاکستان نے منظور کر لی، اور وہ اس ادارے میں تدوین لغت کے کام سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں وہ ۱۹۵۷ء میں "اردو نامہ" نامی رسالے کے مدیر مقرر ہوئے۔ اگرچہ پاکستان میں ان کے لیے حالات ہمیشہ سازگار نہیں رہے مگر انھوں نے کسی بھی مشکل کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔

اس کے حوالے سے ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"میرے پاکستان جاتے ہی، یعنی جنگل کے چوتھی طرف جاتے ہی ایک قیامت کا زلزلہ برپا ہو گیا پورا پاکستان اور شہر کراچی تو اس قدر بلبلا اٹھا گویا صور قیامت پھونک دیا گیا ہو، تمام چھوٹے بڑے اردو انگریزی اخباروں کے لشکر خم ٹھونک کر میدان جنگ میں آگئے ادباء و شعراء اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیاں سے نکال کے میرے خلاف مضامین، قطعات اور کارٹون کی بھرمار کر دی۔" (۳۵)

جوش ملیح آبادی نے پاکستان ہجرت کے حوالے سے اپنی متعدد تحریروں اور بیانات میں تفصیلی وضاحتیں پیش کی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے کئی بار ہندوستان واپس جانے کا ارادہ کیا مگر ان کی خودداری اور غیرت نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ جوش ایک باغی مگر با اصول انسان تھے، وہ اپنی زمین، اپنے نظریات اور اپنے فیصلوں سے پیچھے ہٹنے کے قائل نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام تر مشکلات، تنہائی اور محرومیوں کے باوجود تادم آخر پاکستان میں مقیم رہے۔ وہ ۲۲ فروری ۱۹۸۶ء کو اسلام آباد میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

ان کی وفات کی خبر سنتے ہی ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ نہ صرف ادیب و شاعر بلکہ عام عوام بھی گہرے دکھ میں مبتلا ہو گئے۔ جوش ملیح آبادی صرف ایک شاعر نہیں بلکہ انسانیت کے علمبردار تھے، جو ہر عام و خاص سے محبت اور ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت میں وہ جاذبیت تھی جو قوم، زبان اور انسانیت سے یکساں محبت پر مبنی تھی۔

جوش کو اپنی زبان اردو سے گہری عقیدت تھی۔ وہ اردو کو تہذیب، فکر اور قومیت کا مظہر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں انگریزوں سے اور انگریزی زبان و طرز زندگی سے سخت نفرت تھی۔ ان کے نزدیک انگریزی محض ایک زبان نہیں بلکہ غلامی کی علامت تھی۔ اپنی نثر اور مضامین میں انھوں نے اُن طبقوں پر شدید تنقید کی ہے جو انگریزی تہذیب کے اندھے مقلد بن گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو قوم اپنی زبان سے منہ موڑ لے، وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہے۔ یوں جوش ملیح آبادی کی پوری زندگی اپنی زبان، اپنی قوم اور اپنے نظریات کی حفاظت کی جدوجہد میں گزری۔ وہ محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک عہد کا ضمیر تھے، جنھوں نے اپنی شاعری، نثر اور عمل کے ذریعے آزادی فکر، خودداری اور انسانی وقار کا پیغام دیا۔

آپ بیتی یادوں کی برات: تعارف

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی یادوں کی برات پہلی بار ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی پانچ ابواب اور ۷۴۵ صفحات پر محیط ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی پر بہت عرصہ محنت کی اور اس کو بار بار لکھ کر حذف کر دیتے کیونکہ وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ انھوں نے تین مسودے تیار کیے اور ان کو تلف کر دیا پھر انھوں نے چوتھا مسودہ لکھا اور یہی آگے چل کر ان کی آپ بیتی کی شکل میں شائع ہوا۔ اس بارے میں جوش خود لکھتے ہیں:

"ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ تیار کیا، اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا پھر ڈیڑھ برس میں دوسرا مسودہ مکمل کیا، اس پر بھی تنسیخ کا خط کھینچ دیا، پھر ڈیڑھ پونے دو سال صرف کر کے نو سو صفحوں کا تیسرا مسودہ تحریر کیا۔۔۔ مگر جب اس پر غائر نظر ڈالی تو پتہ چلا اس مسودے کو بھی میں نے ایک گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے، جو صبح کو بیدار ہو کر، رات کے خواب کو، اس خوف سے جلدی جلدی، الٹا سیدھا لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے اور خدا خدا کر کے یہ چوتھا مسودہ شائع کیا جا رہا ہے۔" (۳۶)

جوش ملیح آبادی اپنی تحریر کے معاملے میں انتہائی حساس، سنجیدہ اور خود تنقید کے عادی تھے۔ وہ محض لکھ دینا کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ہر مسودے کو بار بار پرکھتے اور کمزوری محسوس ہوتے ہی تلف کر دیتے۔ ان کے نزدیک آپ بیتی صرف یادوں کا بیان نہیں بلکہ فن، احساس اور صداقت کا امتزاج تھی۔ چوتھا مسودہ ان کی طویل جدوجہد، فکری پختگی اور تحریری دیانت کا حاصل تھا جو بالآخر "یادوں کی برات" کی صورت میں سامنے آیا۔

"یہ کتاب اُردو میں تقریباً تمام سوانح عمریوں پر سبقت رکھتی ہے۔ اور اُردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کی دلچسپی اس لحاظ سے زیادہ ہے۔ کیونکہ جوش نے اپنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں، گمراہیوں، آوارگیوں، سرکشوں، معاشقوں اور گناہوں پر سیر بحث حاصل کی ہے۔" (۳۷)

"یادوں کی برات" بلاشبہ ایک خود نوشت سوانح حیات ہے مگر صرف واقعاتی بیان تک محدود نہیں رہتی۔ جوش نے اس میں اپنی زندگی کے ہر ڈھکے چھپے احوال کو بے باکی سے ظاہر کیا ہے۔ اس کتاب کی اصل دلکشی اس کے زبان و بیان کے جادو، نثر کے دلاویز اسلوب، انکشافِ ذات کے بعض متنازعہ پہلوؤں، واقعات کے بیان میں افسانہ طرازی کی چاشنی، بے لاگ جنسی اظہار اور اس عہد کے تہذیبی و معاشرتی مرقعے

میں پنہاں ہے۔ خاص طور پر جوش نے اپنی شخصیت، داخلی کائنات اور نفسیاتی تہوں کو جس بے خوفی سے کھولا ہے، اس نے یادوں کی برات کو شخصی مطالعے، نفسیاتی تجزیے اور ادبی و آفاقی قدر کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت عطا کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کتاب کی مقبولیت کا بنیادی سبب اس کا دلکش اسلوب ہے تو غلط نہ ہوگا۔

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی میں ان کی پوری زندگی کا نقشہ نہایت تفصیل اور سچائی کے ساتھ ابھرتا ہے۔ انھوں نے اس میں اپنے بچپن، جوانی، نکاح، خاندانی پس منظر اور ذاتی تجربات تک ہر پہلو کو بے تکلفی سے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جوش نے اپنے ادبی ماحول اور علمی پس منظر کا بھی بھرپور تذکرہ کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کے گھر میں اکثر و بیشتر ادبی محفلیں، شعری نشستیں اور بحث و مباحثے برپا رہتے تھے جنہوں نے ان کی فکری تشکیل میں گہرا اثر ڈالا۔ انھوں نے اپنے مشاغل، مطالعے کی عادت، شاعری سے لگاؤ، عشقِ علم اور انسان دوستی کے جذبات کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جوش کے نزدیک مطالعہ صرف شوق نہیں بلکہ زندگی کا مقصد تھا اور شاعری ان کے لیے اظہارِ ذات کا سب سے خوبصورت وسیلہ۔ وہ خود کو عشق، علم اور انسانیت کے جذبات میں سنجیدہ انسان قرار دیتے ہیں جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا سمجھتا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں ہر اس شخص کا ذکر ہے جس نے ان کی زندگی میں کسی نہ کسی طرح اثر چھوڑا، چاہے وہ دوست ہو یا عام جاننے والا۔ اس طرح "یادوں کی برات" صرف ایک شخص کی زندگی نہیں بلکہ ایک عہد، ایک خاندان اور ایک تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتی ہے۔

سعید خان جوش ملیح آبادی کی اس آپ بیتی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"یادوں کی برات ایک عظیم شاعر کی آپ بیتی اور ایک تاریخ ساز عہد کی تہذیبی زندگی کا دلکش مرقع ہے۔ اس مرقعے میں آپ کو وادیِ گنگ و جمن اور سرزمینِ دکن کے قدیم و جدید معاشرے کی خوشنما جھلکیاں نظر آئیں گی۔ مصنف نے اپنے ایامِ طفلی و جوانی کے خوشحال طبقوں کی سمجھائی قدروں پر، ان طبقوں کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز پر، ان کے عقیدوں اور وہموں پر، ان کے شوق اور مشغلوں پر، ان کے تیوہاروں اور تقریبوں پر، ان کے رہن سہن اور رسوم و رواج پر روزمرہ کے واقعات سے بڑے دلچسپ تبصرے کیے ہیں۔" (۳۸)

جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی "یادوں کی برات" میں اپنے عہد کے ادبی، تہذیبی اور معاشرتی منظر نامے کو بڑی جامعیت اور بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اُس وقت کے

ادبی حلقے نہایت فعال اور پُر رونق تھے، جہاں شعر و ادب کے قدردان کثرت سے موجود تھے۔ جوش خود بھی اُس دور کی بڑی بڑی علمی و ادبی محفلوں کا حصہ تھے اور معروف رسائل و جرائد سے وابستہ رہ کر ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انھوں نے جن اداروں میں کام کیا یا جہاں جہاں ان کی تقرری ہوئی، وہاں کے حالات، لوگوں کے رویے اور ماحول کا نقشہ تفصیل سے کھینچا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے عہد کی تہذیب و ثقافت، معاشرتی میل جول اور انسانی روابط کو بھی نہایت دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس وقت ہندو مسلم تعلقات میں گہری رواداری اور بھائی چارہ پایا جاتا تھا۔ مسلمان ہولی میں شریک ہوتے اور ہندو عید پر خوشی مناتے گویا زندگی میں فرقہ واریت کے بجائے انسانیت کی ہم آہنگی غالب تھی۔

جوش ملیح آبادی کو فطرت سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں صبح کی خوبصورتی، موسموں کی تبدیلی اور فطری مناظر کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری ان کے ساتھ چلتا محسوس کرتا ہے۔ اپنی زندگی کے جذباتی پہلوؤں کو بھی جوش نے غیر معمولی سچائی اور بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے اٹھارہ معاشقوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے صرف دو کے نام ظاہر کیے، باقی کے لیے علامتی حروف جیسے "ج"، "س"، "ش"، "ع" وغیرہ استعمال کیے۔ ان کی خود نوشت کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے کسی پہلو کو چھپایا نہیں جو کچھ دیکھا محسوس کیا اور جیا، اسے جرأت اور بے باکی سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔

ان کی آپ بیتی کی زبان سادہ مگر پراثر ہے اور کہیں کہیں فصاحت و بلاغت کے ساتھ تکلف کا تاثر بھی پیدا ہوتا ہے۔ محاوروں، تشبیہوں اور جزئیات نگاری نے بیان کو دلکش بنا دیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قاری خود ان مناظر میں موجود ہو۔ دوستوں اور احباب کے خاکے انھوں نے اس طرح پیش کیے ہیں کہ قاری کے ذہن میں ان کی واضح تصویریں ابھر آتی ہیں۔ جوش نے اپنی آپ بیتی میں انگریز حکومت سے اپنی نفرت کا بھی کھل کر اظہار کیا ہے اور اپنے انقلابی خیالات اور سیاسی شعور کو غیر معمولی قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"یادوں کی برات" پر اس کی بے باکی اور صاف گوئی کے باعث کئی اعتراضات کیے گئے۔ اس کا کچھ حصہ اشاعت کے وقت حذف بھی کر دیا گیا، تاہم بعد ازاں ڈاکٹر ہلال نقوی نے اس کی تکمیل و تدوین کر کے مکمل صورت میں دوبارہ شائع کیا۔ اعتراضات کے باوجود یہ آپ بیتی اپنی جرأتِ اظہار، سچائی اور ادبی وقار کے باعث اردو ادب میں ایک منفرد اور بے مثال خود نوشت کی حیثیت رکھتی ہے۔ جوش کی شخصیت میں جو آزاد خیالی، صداقت پسندی اور انقلابی جذبہ تھا، وہی پوری توانائی کے ساتھ اس تصنیف میں جھلکتا ہے۔

حوالہ جات

۱. شاہد حسین ڈار، ادب سماج اور کلچر، (اردو ریسرچ جرنل، ۲۰۲۰)۔
۲. جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲)، ص ۱۵۱۱۔
۳. وارث سرہندی، جامع علمی اردو لغت، (لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۳ء)، ص ۹۳۶۔
۴. ذیشان الحسن عثمانی، شعور علم سے آگہی کا سفر، (اسلام آباد: گفتگو پبلی کیشنز، اکتوبر ۲۰۱۷ء)، ص ۱۲۔
۵. عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی زاویے، (لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۵۱ء)، ص ۹۔
۶. سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، (لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۶ء)، ص ۴۰۔
۷. وارث سرہندی، جامع علمی اردو لغت، (لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۳ء)، ص ۹۳۴۔
۸. جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲)، ص ۱۵۴۵۔
۹. محمد صدیق قریشی، کشاف اصطلاحات تاریخ، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸)، ص ۱۵۷۔
۱۰. غلام رسول مہر، تاریخ کی تاریخ (مضمون، روزنامہ دنیا، ۲۵ جولائی ۲۰۲۲ء)۔
۱۱. ایضاً
۱۲. شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع سوئم، ۲۰۰۸ء)، ص ۶۴۸۔
۱۳. جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲)، ص ۱۵۱۱۔
14. Quincy wright, *The Study of International relations*, New York, 1995 , pg 133
۱۵. خورشید ندیم، سیاسی شعور یا سیاسی بیجان، (مضمون، روزنامہ دنیا، ۲۰۲۳ء)، ص ۸۔

۱۶. حماد اللہ، پاکستانی سیاسی آپ بیتوں میں سیاسی ، سماجی شعور کا تقابل ، مقالہ برائے ایم فل اُردو، (اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۱۹ء)، ص ۵۷، ۵۸۔

۱۷. ایضاً، ص ۶۳۔

۱۸. کامران کاظمی، ڈاکٹر، اردو ناول میں عصریت، (لاہور: الوتار پبلیکیشنز، ۲۰۲۳ء)، ص ۴۹۔

۱۹. کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، یادوں کا جشن، (جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء)، ص ۲۳۔

۲۰. نارنگ ساقی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۱۔

۲۱. جمیل جالبی "محبوتوں کا پیامبر۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر" مشمولہ مہندر سنگھ بیدی سحر۔ فن اور شخصیت مرتبہ نارنگ ساقی، عقیل احمد (نئی دہلی: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریچر ٹرسٹ، ۲۰۲۳ء)، ص ۵۸۔

۲۲. جوش ملیح آبادی "جوش ملیح آبادی کے تاثرات" مشمولہ مہندر سنگھ بیدی سحر۔ فن اور شخصیت مرتبہ نارنگ ساقی، عقیل احمد (نئی دہلی: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریچر ٹرسٹ، ۲۰۲۳ء)، ص ۲۶۸۔

۲۳. نارنگ ساقی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۶۔

۲۴. ایضاً، ص ۱۳۔

۲۵. کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، یادوں کا جشن، (جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۔

۲۶. ایضاً

۲۷. کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، یادوں کا جشن، (جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۰۵۔

۲۸. نارنگ ساقی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۱۔

۲۹. زبیر لوتھڑ "یادوں کا جشن" مشمولہ مہندر سنگھ بیدی سحر۔ فن اور شخصیت مرتبہ نارنگ ساقی، عقیل احمد (نئی دہلی: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریچر ٹرسٹ، ۲۰۲۳ء)، ص ۱۴۴۔

۳۰. ایضاً، ص ۱۴۴۔

۳۱. ایضاً، ص ۱۴۴۔

۳۲. ایضاً، ص ۱۴۴۔

۳۳. جوش ملیح آبادی، روح ادب، (لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۴۶ء)، ص ۹۔

۳۴. محمد ارشد لئیق، جوش ملیح آبادی: فکرو نشاط کے شاعر (مضمون، روزنامہ اُردو، ۲۱ فروری ۲۰۲۳ء)۔

۳۵. جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، (کراچی: جوش اکیڈمی، ۱۹۷۲ء)، ص ۲۹۶۔

۳۶. ایضاً، ص ۲۳۔

۳۷. محسن مقبول، یادوں کی برات "یا" خوابوں کی سوغات، (مضمون)، مشمولہ: اردو ریسرچ جرنل، جون ۲۰۱۶ء،

۳۸. سعید احمد خان، (انتساب)، یادوں کی بارات از جوش ملیح آبادی، (لاہور: مکتبہ شعر و ادب، ۱۹۷۵ء)، ص ۱

باب دوم:

یادوں کی برات اور یادوں کا جشن میں سیاسی شعور

باب دوم:

یادوں کی برات اور یادوں کا جشن میں سیاسی شعور

سیاسی شعور دراصل وہ فہم و ادراک ہے جو انسان کو اپنے گرد و پیش کے سیاسی، سماجی اور ریاستی نظام کی ساخت اور اس کے اندر اپنے مقام و کردار کا احساس بخشتا ہے۔ جب کوئی فرد یا نمائندہ عوامی، ریاستی یا حکومتی معاملات پر رائے دیتا ہے تو دراصل وہ اپنے سیاسی شعور کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ ایک باشعور انسان نہ صرف اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ ہوتا ہے بلکہ وہ اس آگاہی کو اجتماعی مفاد کے تناظر میں برتنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ سیاست کے عمل سے متعلق اپنی الگ رائے اور نظریہ رکھنا، ریاستی معاملات کو سمجھنا اور ان پر تنقیدی بصیرت رکھنا یہ سب سیاسی شعور کی مظاہر ہیں۔ جب کوئی ادیب، شاعر یا قلم کار اس سیاسی شعور کے ساتھ کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو اس کی تحریر محض تخلیق نہیں رہتی بلکہ ایک عہد کی سیاسی و سماجی روح کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔

اردو ادب میں سیاسی شعور کی جڑیں گہری ہیں۔ یہ شعور نہ صرف اصلاحی اور مزاحمتی ادب میں جھلکتا ہے بلکہ خود نوشت نگاری میں بھی نمایاں ہے۔ خود نوشت دراصل فرد کے تجربے کا اجتماعی حوالہ ہوتی ہے اور اسی لیے سیاسی حالات اس میں از خود شامل ہو جاتے ہیں۔ مہندر سنگھ بیدی سحر کی آپ بیتی اس ضمن میں ایک اہم مثال ہے جہاں مصنف نے اپنے عہد کے سیاسی تغیرات کو اپنی زندگی کے آئینے میں دیکھا۔ آزادی کی تحریک، تقسیم ہند اور بعد از تقسیم حالات کی تصویر کشی میں بیدی سحر کا سیاسی شعور ان کی فکری بصیرت کو اجاگر کرتا ہے۔ کتاب "یادوں کا جشن" دراصل ایک دلکش اور سچی زندگی کی جھلک پیش کرتی ہے۔ یہ صرف ایک آپ بیتی نہیں بلکہ ایک ایسا بیانیہ ہے جو قاری کو ابتدا سے آخر تک اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ مصنف نے اپنی زندگی کے سفر کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ محض واقعات کا بیان نہیں بلکہ تجربات، احساسات اور سچائیوں کا عکس بن جاتا ہے۔ اس تحریر کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار، روانی اور زندگی کی رنگارنگی ہے جو ہر صفحے پر جھلکتی ہے۔ بیدی صاحب نے اپنی ذات کو کسی مثالی کردار یا "فرشتے" کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ ایک عام انسان کے طور پر دکھایا ہے جو غلطیاں بھی کرتا ہے، محسوس بھی کرتا ہے اور سچ بولنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ یہی سچائی اور خود احتسابی اس کتاب کو عام آپ بیتوں سے منفرد بناتی ہے۔ دراصل "یادوں کا

جشن "محض یادوں کا بیان نہیں بلکہ زندگی کے جشن اس کی روشنیوں اور سیاہیوں دونوں کا بے لاگ اعتراف ہے جو مصنف کی صداقت اور فکری بلوغت کا ثبوت دیتا ہے۔

"یادوں کا جشن" کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی قلم فرسائی کرتے ہیں:

"یادوں کا جشن" ایک اچھے ناول کی طرح ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے کہ جسے آپ شروع کرتے ہیں تو ختم کیے بغیر بند نہیں کرتے۔ میں نے سفر لاہور کے دوران اس کا مطالعہ شروع کیا اور فرصت کے وقت میں سفر واپسی تک ۴۵۹ صفحات کی یہ کتاب ختم ہو گئی۔۔۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سفر دوسری سطر سے مختلف ہے۔ اس میں اختصار بھی ہے اور بیان کی روانی بھی، زندگی کی رنگارنگی کی طرح ایک ایسا تنوع ہے کہ اسے آپ ایک دلچسپ داستان کی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی داستان حیات ہے جس نے کھل کر سچ بولا ہے اور جس نے اپنے آپ کو فرشتہ بنانے کے بجائے پوری طرح انسان رہنے کی کوشش کی ہے۔" (۱)

یہی وجہ ہے کہ اس آپ بیتی کو ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ ادیب جب اپنے تجربات کو سیاسی تناظر میں بیان کرتا ہے تو وہ نہ صرف اپنی ذات کا بیان کرتا ہے بلکہ اپنے عہد کی اجتماعی داستان رقم کرتا ہے۔ مہندر سنگھ بیدی سحر کی خودنوشت اس شعور کی زندہ مثال ہے جہاں فرد کی زندگی، عہد کی سیاست اور قوم کا المیہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی یادوں کا جشن میں سیاسی شعور:

اکثر سوانح عمریاں ایسی لکھی جاتی ہیں جن میں مصنف اپنی ذات کو مرکز بنا لیتا ہے اور باقی تمام شخصیات یا تو پس منظر میں چلی جاتی ہیں یا ان کا ذکر صرف اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ایسے مصنف اپنی آپ بیتی میں خود کو ایک ایسے کامل اور بے عیب انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں جو انسانی کمزوریوں سے بالکل پاک ہو۔ ان کی تحریر میں خود ستائشی کارنگ نمایاں ہوتا ہے اور حقیقت پسندی کم نظر آتی ہے۔ اس طرح کی سوانح عمریاں قاری کو ایک انسان کی حقیقی زندگی کے بجائے ایک خیالی کردار کے قریب لے جاتی ہیں جس میں جذبات تو موجود ہوتے ہیں مگر سچائی کی وہ شدت نہیں جو زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

اس کے برعکس یادوں کا جشن ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں مہندر سنگھ بیدی نے اپنی شخصیت کو حقیقت کے آئینے میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کامیابیوں کے ساتھ اپنی کمزوریوں کو بھی تسلیم کیا ہے اور اپنی ذات کے ساتھ ساتھ زمانے کے حالات، معاشرتی صورت حال اور انسانی رشتوں کی باریکیوں کو بھی جگہ دی ہے۔ یہی بات اس کتاب کو دوسری سوانح عمریوں سے ممتاز بناتی ہے۔ بیدی نے اپنی زندگی کے تجربات کو نہ صرف سچائی سے قلم بند کیا بلکہ اس میں اپنے عہد کے سیاسی، تہذیبی اور سماجی پہلوؤں کو بھی جگہ دی جس سے ان کی خود نوشت محض ذاتی داستان نہیں رہتی بلکہ ایک عہد کی عکاسی بن جاتی ہے۔ یہی خصوصیت یادوں کا جشن کو سوانح حیات کی اعلیٰ مثالوں میں شامل کرتی ہے۔ اس خود نوشت کے بارے میں عمر جاوید کے الفاظ یوں ہیں:

"بعض سوانح حیات ایسی ہیں کہ جن میں اپنے علاوہ کسی اور کو اس قابل سمجھا ہی نہیں جاتا کہ اس کی تعریف میں کچھ لکھا جائے اس لئے اپنی آپ بیتی لکھنے والا ایک طرح سے سپر مین دکھائی دیتا ہے جو ہر طرح کی بشری کمزوری سے پاک ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے کہ جنھوں نے سوانح حیات لکھتے ہوئے اپنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنی خامیوں کا بھی ذکر کیا ہو اور اپنی ذات کے ساتھ ساتھ معروض اور حالات کو بھی اہمیت دی ہو۔ کتاب "یادوں کا جشن" کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ سوانح حیات کی کسوٹی پر پورا اترنے والی کتاب ہے۔" (۲)

مہندر سنگھ بیدی سحر نہ صرف ایک باکمال شاعر اور ادیب تھے بلکہ ایک فعال سرکاری افسر، منتظم اور صاحبِ فہم و بصیرت شخصیت بھی تھے۔ وہ مجسٹریٹ، اسسٹنٹ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر جیسے اہم عہدوں پر فائز رہے، جہاں انھیں سیاسی و انتظامی معاملات کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ یہی تجربات ان کی آپ بیتی "یادوں کا جشن" میں بڑی باریکی سے جھلکتے ہیں۔ یہ آپ بیتی دراصل اُن کی زندگی کی روداد ہی نہیں بلکہ اُس عہد کے تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات کا معتبر آئینہ بھی ہے جس میں وہ جیے۔ بیدی نے اس تصنیف میں اپنے بچپن، جوانی، ملازمت اور عہدِ تقسیم تک کے تمام مراحل نہایت سادگی مگر غیر معمولی بصیرت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اُن کی زندگی کے واقعات محض شخصی نہیں بلکہ عہد کے سیاسی تناظر سے جڑے ہوئے ہیں اور وہ واقعات پڑھنے سے ایسے لگتا ہے جیسے کسی فلم کا کوئی سین چل رہا ہو۔

"پنجاب کے علاقے منگمری (ساہیوال) کے جاگیر دار گھرانے میں جنم لینے والے کنور مہندر سنگھ بیدی نے اپنی اس آپ بیتی میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے متحدہ پنجاب کے حالات کو اس قدر واقعاتی انداز سے

پیش کیا ہے کہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ کتاب نہیں پڑھ رہے بلکہ کوئی فلم دیکھ رہے ہیں جس میں منظر کشی ہمارے سامنے ہی ہو رہی ہے۔" (۳)

برصغیر کی تقسیم کا ہولناک واقعہ، جس کا وہ خود عینی شاہد تھے ان کی آپ بیتی کا مرکزی حوالہ ہے۔ بیدی نے اپنی سرکاری ذمہ داریوں کے دوران نہ صرف فسادات کے اثرات کو قریب سے دیکھا بلکہ عوام کے دکھ، مہاجرین کی آباد کاری اور انتظامی بحرانوں سے نبرد آزما ہونے کے تجربات کو انتہائی غیر جانب دارانہ مگر حساس انداز میں بیان کیا۔ انھوں نے دکھایا کہ ایک ذمہ دار منتظم کے لیے صرف انتظامی صلاحیت کافی نہیں بلکہ سیاسی شعور بھی ناگزیر ہے کیونکہ یہی شعور اسے عوامی مسائل کو انسانی ہمدردی اور عملی بصیرت کے ساتھ حل کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔ بیدی نے اپنے فیصلوں، ترجیحات اور طرزِ عمل سے ثابت کیا کہ وہ ایک ایسے صاحبِ نظر انسان تھے جو اپنے عہد کے سیاسی اتار چڑھاؤ کو گہری بصیرت سے سمجھتے تھے۔

ان کی آپ بیتی کا ایک اہم پہلو ان کا انگریزوں کے ساتھ تعلق ہے۔ چونکہ وہ برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ ملازمت کر رہے تھے اس لیے اکثر ان کی راہیں انگریز افسران سے ٹکرائیں۔ بیدی کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں انگریزوں کا تحکمانہ اور نسلی برتری پر مبنی رویہ ہرگز پسند نہ تھا۔ وہ غلامی کی ذہنیت سے آزاد اور خوددار انسان تھے جو محض رسمی سلام دعا تک خود کو محدود رکھتے اور غیر ضروری اطاعت سے گریز کرتے۔ یہی رویہ دراصل ان کے سیاسی شعور کا مظہر تھا۔ ایک ایسا شعور جو آزادیِ فکر، خودداری اور قومی وقار کے احساس سے جڑا ہوا تھا۔ بیدی نے اگرچہ کہیں کھل کر انگریزوں کی مخالفت نہیں کی لیکن ان کے طرزِ تحریر اور بعض واقعات کی عکاسی سے قاری بخوبی سمجھ لیتا ہے کہ وہ ذہنی و فکری طور پر کسی بیرونی بالادستی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

"یادوں کا جشن" ایک ایسی خودنوشت ہے جو ذاتی تجربات سے بڑھ کر اجتماعی شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں ایک فرد کے احساسات، ایک افسر کے تجربات، ایک شاعر کے جذبات اور ایک محبِ وطن کے خیالات ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ بیدی کی نگاہ صرف اپنی ذات تک محدود نہیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی اور انسانی المیوں پر بھی مرکوز ہے۔ ان کی آپ بیتی دراصل ایک ایسے باشعور فرد کی گواہی ہے جو اپنے عہد کے تضادات، سیاست کے نشیب و فراز اور انسانیت کے دکھ کو گہرائی سے سمجھتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو "یادوں کا جشن" کو اردو خودنوشت ادب میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے اور مہندر سنگھ بیدی کے سیاسی شعور کو ایک زندہ اور پُر اثر حقیقت کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ اسی ضمن میں محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خود نوشت یا سوانح عمری اردو کی اہم ترین صنف ہے۔ اس کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس سے نہ صرف ہمیں اس شخص کی تفصیلی زندگی معلوم ہوتی ہے بلکہ جس ماحول میں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی اس کا نقشہ بھی سامنے آ جاتا ہے۔ دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُس عہد کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ اس کی روشنی میں اس عہد کا سماجی و ادبی اور تہذیبی زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ اردو کی چند کامیاب خود نوشت سوانح حیات ہیں۔ انھیں میں "یادوں کا جشن" بھی ہے۔" (۴)

تقسیم بر صغیر کے فوراً بعد سب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلم فسادات کا تھا جس نے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ حالات اس قدر بگڑ گئے تھے کہ انسان کی جان کی کوئی قیمت نہ رہی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں میں خون بہنا ایک عام منظر بن چکا تھا۔ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کے ساتھ چلنے والا شخص دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہے تو وہ لمحوں میں اس کی جان لے لیتا۔ ایسے پر آشوب وقت میں مہندر سنگھ بیدی نے نفرت کے بجائے اتحاد کا پیغام دیا۔ انھوں نے اس تلخ حقیقت کو بخوبی سمجھا کہ جب تک عوام کے دلوں میں بے ہوئے غم اور غصے کو ختم نہیں کیا جائے گا ملک میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ یہی سیاسی شعور رکھنے والا ذہن تھا جو بیدی کے فیصلوں کی بنیاد بنا۔ انھوں نے جان لیا کہ اگر عوام کی سوچ کو سکون نہ دیا گیا تو آزادی کے ثمرات بھی برباد ہو جائیں گے۔

مہندر سنگھ بیدی نے تقسیم کے بعد ہی نہیں بلکہ تقسیم سے پہلے بھی ہر موقع پر ہندو مسلم اتحاد کی بات کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی اصل طاقت ان دو بڑی قوموں کے باہمی رشتے میں پوشیدہ ہے۔ اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اخوت اور رواداری کے جذبے سے جڑ جائیں تو کوئی طاقت ان پر غالب نہیں آ سکتی۔ انگریز دور حکومت میں بھی وہ بارہا اس اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک آزادی اسی وقت ممکن تھی جب نفرت کے بجائے محبت کو فروغ دیا جائے۔ اسی تناظر میں وہ جنگ عظیم دوم کے زمانے میں ہندوستان کی آزادی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصل آزادی تلوار یا بندوق سے نہیں بلکہ دلوں کے اتحاد اور باہمی احترام سے حاصل ہوتی ہے۔ میں سرکاری ملازم ضرور تھا مگر میری ہمدردی انہیں کے ساتھ تھی جو ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ البتہ میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ جنگ جیتنے پر انگریز ممکن ہی نہیں بلکہ اغلب ہے کہ انگریز ہندوستان کو آزاد کر دیں گے لیکن اگر خدا نخواستہ جرمنی اور جاپان جنگ جیت گئے تو ہندوستان کی آزادی اگر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خواب بن کر نہ رہ گئی تو سیکڑوں سال تک ملتوی ضرور ہو جائے گی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈر بھی دراصل یہ سب کچھ سمجھتے

تھے لیکن بظاہر وہ جنگ میں عدم تعاون کر رہے تھے۔ میں جب چیف کمشنر سے ملنے گیا تو اس سے اس مسئلے پر کافی دیر تک بات چیت ہوئی۔ میں نے اس سے کہا میری رائے میں ہندوستانیوں کا تعاون حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ انگریز کھلم کھلا وعدہ کریں کہ جنگ کے بعد ہندوستان آزاد کر دیا جائے گا اور تب تک کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی تحریک زوروں سے جاری کی جائے تاکہ یہ لوگ آپس میں نہ لڑیں کیونکہ اس صورت میں اگر وہ جنگ میں تعاون کرنا بھی چاہیں گے تو وہ مؤثر نہ ہو گا۔ (۵)

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی میں اس پہلو پر گہرے سیاسی شعور، حقیقت پسندی اور حب الوطنی کا اظہار ملتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے مگر ان کی ہمدردیاں ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ رہیں جو ملک کی آزادی کے لیے سرگرم تھے۔ اس اقتباس سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ بیدی صاحب محض ایک سرکاری اہلکار نہیں تھے بلکہ وہ ایک ایسے صاحب نظر انسان تھے جو بین الاقوامی سیاسی منظر نامے کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے نہایت حقیقت پسندی سے یہ بات محسوس کی کہ اگر برطانیہ جنگ عظیم دوم میں کامیاب ہوا تو شاید وہ ہندوستان کو آزادی دینے پر مجبور ہو جائے لیکن اگر جرمنی یا جاپان غالب آگئے تو آزادی کا خواب صدیوں تک ادھورا رہ جائے گا۔ یہ طرز فکر ان کی دوراندیشی اور سیاسی حالات پر گہری نظر کا مظہر ہے۔

مزید برآں بیدی صاحب نے انڈین نیشنل کانگریس کے طرز عمل پر بھی ایک نہایت متوازن تبصرہ کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ کانگریسی رہنما اصل صورتحال سے واقف ہیں لیکن سیاسی حکمت عملی کے تحت انھوں نے جنگ میں عدم تعاون کی راہ اپنائی۔ بیدی صاحب کا چیف کمشنر سے مکالمہ دراصل ان کے سیاسی فہم اور اصلاحی مزاج کی علامت ہے۔ انھوں نے عملی طور پر یہ تجویز دی کہ اگر انگریز حکومت کھلے عام ہندوستان کی آزادی کا وعدہ کرے اور ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دے تو جنگ میں ہندوستانیوں کی حمایت خود بخود حاصل ہو جائے گی۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ آزادی سے پہلے اتحاد کا تھا، کیونکہ جب تک عوام ایک دوسرے کے دشمن بنے رہیں گے تب تک آزادی کا حصول محض ایک خواب ہی رہے گا۔ یہ موقف نہ صرف ان کی سیاسی بصیرت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ مہندر سنگھ بیدی ایک ایسے روشن فکر ادیب اور عملیت پسند شخص تھے جو نظریات کو جذبات سے نہیں بلکہ عقل و فہم سے دیکھتے تھے۔ اس موقع پر انھوں نے ایک اہم مقصد کے تحت ہندو مسلم اتحاد کی بات کی جو ملک کے لیے خوش آئند قدم تھا۔ اسی حوالے سے آگے چل کر بات کرتے ہیں کہ

"ہندو مسلم اتحاد پر میں صدق دل سے یقین رکھتا تھا۔ میں نے محسوس کیا جنگ میں جیت ہو یا ہار کم از کم ہندوستانی تو آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں گے۔" (۶)

مہندر سنگھ بیدی کے نزدیک آزادی سے بھی زیادہ اہم مقصد ہندو مسلم اتحاد تھا کیونکہ ان کے خیال میں قوم کی بقاء، ترقی اور امن کے تمام مقاصد اسی اتحاد میں مضمر تھے۔ اُن کا یقین تھا کہ جب تک برصغیر کے عوام باہم متحد نہیں ہوں گے۔ اُس وقت تک نہ تو آزادی کے خواب کو تعبیر مل سکتی ہے اور نہ ہی قوم کو داخلی استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کا تبادلہ دہلی میں ہوا تو انھوں نے اپنی تمام تر توانائیاں اسی نصب العین کے لیے وقف کر دیں۔ بیدی صاحب نے عملی سطح پر بھی اتحاد کے فروغ کے لیے مختلف حکمت عملیاں اختیار کیں۔ یہاں تک کہ اپنے دفتری عملے میں تبدیلیاں کر کے ایسے افراد کو ساتھ رکھا جو بین المذاہب ہم آہنگی پر یقین رکھتے تھے۔

مہندر سنگھ بیدی کا ایمان تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ہی امن، سماجی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی بنیاد ہے۔ اُن کے نزدیک اگر قوم متحد ہو تو نہ صرف عوامی رائے ہموار کرنا آسان ہوتا ہے بلکہ آزادی کی جدوجہد میں بھی کامیابی یقینی بن جاتی ہے۔ انھوں نے اس بات کو گہرائی سے محسوس کیا کہ آزادی کے قریب آتے لمحوں میں اگر ہندو اور مسلمان باہم دست و گریبان ہوئے تو آزادی کا خواب بکھر جائے گا۔ یہی سوچ انہیں اس سمت لے گئی کہ وہ ہر ممکن ذریعہ اختیار کریں جس سے برصغیر میں رواداری اور باہمی اعتماد کو فروغ ملے۔

یہ وہ دور تھا جب دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی اور انگریز ہر قیمت پر اپنی فتح کے خواہاں تھے۔ بیدی صاحب نے اس نازک موقع کو برصغیر کے اتحاد کے فروغ کے لیے ایک موقع کے طور پر دیکھا۔ اُن کی رائے میں یہی وہ وقت تھا جب عوام کے درمیان فاصلے کم کر کے ایک مشترکہ قومی جذبہ پیدا کیا جاسکتا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ یہ بات کہی اور عملی طور پر ثابت بھی کیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں نہیں بلکہ ایک ہی دھرتی کے سپوت ہیں جن کا دکھ سکھ، زبان، ثقافت اور تہذیب مشترک ہے۔ اسی اتحاد میں ہندوستان کی سلامتی اور مستقبل پوشیدہ ہے۔

مہندر سنگھ بیدی جہاں جہاں خدمات انجام دیتے رہے، وہاں انھوں نے اتحادِ ملت کو اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھا۔ اُنہیں کچھ عرصے کے لیے "نیشنل وار فرنٹ" سے بھی وابستہ رکھا گیا جو بظاہر ایک غیر سیاسی تنظیم تھی لیکن اس کے تحت قوم میں اتحاد، ہم آہنگی اور قومی شعور بیدار کرنے کے لیے مختلف ثقافتی و ادبی سرگرمیوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ بیدی صاحب نے اس پلیٹ فارم کو بھی مثبت انداز میں استعمال کیا۔

انھوں نے مشاعرے، رقص و موسیقی کی محفلیں اور ادبی تقاریب منعقد کروائیں تاکہ لوگ اپنی روایات و ثقافت سے جڑے رہیں اور مذہبی اختلافات کے بجائے اپنی مشترکہ تہذیبی شناخت پر فخر محسوس کریں۔

ان تقریبات کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ روایتیں کسی ایک مذہب کی جاگیر نہیں ہوتیں، بلکہ وہ پورے معاشرے کی روح ہوتی ہیں۔ بیدی صاحب چاہتے تھے کہ ان روایات کے ذریعے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب آئیں، ایک دوسرے کی ثقافت کو سمجھیں اور نفرت کی دیواروں کے بجائے محبت کے رشتے مضبوط کریں۔ یوں ان کی تمام کوششوں کا محور یہ تھا کہ برصغیر میں ایک ایسی فضا قائم ہو جہاں باہمی احترام، رواداری اور اتحاد کے سائے تلے ایک مضبوط اور آزاد قوم جنم لے۔

"ہمارے محکمے کی مذکورہ سرگرمیوں کے علاوہ ہر سال ایک "نیشنل وار فرنٹ ویک" منایا جاتا تھا جس میں پورے سات دن تک مختلف پروگرام ہوتے تھے۔ مشاعرہ، کوی سیمیلن پنجابی کوی دربار کے علاوہ رقص و موسیقی کے پروگرام بھی ہوتے تھے۔ افتتاح اور صدارت کے لیے ملک کے برگزیدہ رہنماؤں کو مدعو کیا جاتا تھا۔" (۷)

نیشنل وار فرنٹ کا اصل مقصد یہ تھا کہ جنگ عظیم کے لیے ہندوستانی عوام کو جنگ اور انگریز کے حق میں رائے دلوائی جائے۔ بظاہر تو ہندوستانی اس حق میں نہیں تھے۔ خود بیدی صاحب بھی اس کے مقصد سے واقف تھے لیکن ان کو یہ ذمہ داری سوچنی گئی کہ وہ لوگوں کو اس پر آمادہ کریں یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ انگریز نے ہندوستان میں جو کیا وہ کسی سے مخفی نہیں تھا مگر بیدی صاحب کو جب یہ ذمہ داری ملی تو انھوں نے اس میں بھی اولین مقصد یہ رکھا کہ لوگ فرقہ واریت سے دور رہیں۔ اس میں بھی انھوں نے دوستی اور ہمدردی کو پھیلانا اہم مقصد رکھا۔ اس سے یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ مہندر سنگھ بیدی کو جو بھی ذمہ داری دی گئی اس میں انھوں نے ہمیشہ اتحاد اور امن کو ہی ملحوظ خاطر رکھا۔

جہاں بھی مہندر سنگھ بیدی نے خدمات انجام دیں وہاں انھوں نے اتحاد کی نہ صرف بات کی بلکہ اسے مضبوط اور پائیدار بنانے کے لیے عملی جدوجہد بھی جاری رکھی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے ایسے علمبردار تھے جنھوں نے آزادی ہند سے پہلے ہی اس فکر کو عام کیا کہ قوموں کا اتحاد ہی بقا کی ضمانت ہے۔ فکری اور عملی دونوں سطحوں پر وہ اس نظریے کے قائل تھے کہ انسانیت تبھی قائم رہ سکتی ہے جب لوگ آپس میں جڑے رہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو سمجھیں۔ ان کے نزدیک اتحاد کسی وقتی ضرورت کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا نظریہ تھا جو انسان کے باطن میں رچا بسا ہو اور جس کے ذریعے معاشرہ امن و استحکام حاصل کرے۔ برصغیر کی اقوام کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کے پیچھے انگریزوں کی سازشوں کو وہ بخوبی سمجھتے

تھے۔ وہ تو میں جو ایک دوسرے کے ساتھ رہتی، کھاتی پیتی اور دکھ سکھ بانٹتی تھیں، انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا گیا۔ ایسے میں بیدی صاحب نے اپنی بصیرت سے یہ ادراک کر لیا کہ اگر اس نفاق کو ختم نہ کیا گیا تو برصغیر تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے قول و عمل سے وہ اتحاد دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جو صدیوں سے اس دھرتی کی بنیاد رہا ہے۔

مہندر سنگھ بیدی کی پوری زندگی امن اور ہم آہنگی کے فروغ کے گرد گھومتی رہی۔ وہ چاہتے تھے کہ جہاں جھگڑے ہوں وہاں صلح ہو جائے، جہاں نفرت ہو وہاں محبت جنم لے، جہاں قتل و غارت ہو وہاں انسانیت کا بول بالا ہو۔ ان کے مزاج میں نرمی، سمجھداری اور تدبیر نمایاں تھا اور یہی صفات ان کے سرکاری فرائض میں بھی جھلکتی تھیں۔ اکثر انہیں ایسی ذمہ داریاں سونپی گئیں جو امن و امان کے قیام سے متعلق تھیں اور انھوں نے ہمیشہ ان ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھایا۔ آزادی سے پہلے یہ اتحاد ان کی جدوجہد کا محور رہا لیکن جب تقسیم ہند کا سانحہ پیش آیا تو حالات کہیں زیادہ سنگین ہو گئے۔ اس وقت ہر طرف جذبات کی آگ بھڑک اٹھی تھی، انسان اپنی عقل کھو بیٹھا تھا اور مذہبی جنون نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں امن کی بات کرنا کسی مہم جوئی سے کم نہ تھا لیکن بیدی صاحب نے نہ صرف امن کی بات کی بلکہ اسے قائم کرنے کے لیے عملی اقدامات بھی کیے۔ ان کی خود نوشت کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ان مشکل ترین حالات میں بھی انسانیت کے بقا پر یقین رکھتے تھے۔

یہ ان کا سیاسی اور سماجی شعور تھا جس نے انہیں ان خون ریز حالات میں بھی صلح جوئی اور اتحاد کی راہ پر گامزن رکھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر قوم کو جذبات کے طوفان سے نکال کر عقل و شعور کی راہ پر نہ ڈالا گیا تو آنے والی نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔ ان کے نزدیک قیام پاکستان کے بعد سب سے بڑا کام امن کا قیام تھا تاکہ لوگ ایک نئی زندگی کی طرف بڑھ سکیں۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ تقسیم کے بعد اگر صلح اور احساسِ انسانیت کو فروغ نہ دیا گیا تو یہ قتل و غارت کئی برسوں تک جاری رہے گی۔ اسی احساسِ ذمہ داری نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی حیثیت میں رہتے ہوئے قوموں کے درمیان بھائی چارہ اور اتحاد قائم کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں۔

تاریخ ہمیں قیام پاکستان، تقسیم ہند اور ہندو مسلم فسادات کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہے لیکن مہندر سنگھ بیدی کی تحریریں ان واقعات کو ایک ایسے شخص کی آنکھ سے دکھاتی ہیں جس نے یہ سب اپنی زندگی میں جھیلا اور بھگتا۔ وہ صرف مشاہدہ کرنے والے نہیں بلکہ ان حالات میں ایک فعال کردار ادا کرنے والے

فرد تھے۔ ایک سرکاری افسر ہونے کے ناطے انھوں نے جہاں نظم و نسق کی ذمہ داریاں نبھائیں وہاں انسانیت کے علمبردار بن کر لوگوں کے درمیان صلح و آشتی کا پیغام بھی پھیلایا۔ ان کی تحریروں میں تاریخ کا وہ پہلو نمایاں ہے جو کتابوں میں نہیں ملتا بلکہ صرف اُن دلوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے جو دردِ انسانیت رکھتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے دوران پیش آنے والے ان واقعات کی تفصیل خود اُن کی آپ بیتی میں محفوظ ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ امن پسند انسان کس طرح نفرت اور تباہی کے درمیان بھی روشنی کی کرن بن سکتا ہے۔

"منگمری ضلع میں بھی بہت بڑا فساد ہوا۔ قافلوں کے قافلے قتل کر دیے گئے۔ بہت لوٹ ماری ہوئی اور یہ سب کچھ صرف منگمری کے ضلع تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ بھارت اور پاکستان کا کوئی علاقہ ہی ایسا ہو گا جو اس مذہبی جنوں کا شکار نہ ہوا ہو۔ یہ کہنا کہ فساد پہلے کہاں شروع ہوا بڑی مشکل بات ہوگی۔ ادھر ادھر اس قدر اشتعال انگیز افواہیں پھیل رہی تھیں کہ ان کی تصدیق کیے بغیر ہی لوگ جوابی کارروائی شروع کر دیتے تھے۔ ہزاروں لاکھوں کنبے بے گھر ہو گئے۔ لاکھوں یتیم ہوئے ہزاروں عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے اور یہ سب رسول اکرم ﷺ حضرت بابا گورو نانک دیو اور کرشن اوتار کے نام لیواؤں نے کیا تا کہ اپنے اپنے مذہب کا نام اونچا کر سکیں۔" (۸)

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی "یادوں کا جشن" محض ذاتی زندگی کے احوال پر مبنی نہیں بلکہ اس میں اُس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کی بھرپور عکاسی بھی ملتی ہے۔ تقسیمِ ہند کے وقت برصغیر کے سیاسی منظر نامے میں جو انتشار اور بے یقینی کی کیفیت تھی۔ بیدی صاحب نے اسے اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں نہایت حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی تحریر میں فسادات کی وہ جھلک صاف محسوس کی جاسکتی ہے جہاں انسانیت پس منظر میں چلی گئی تھی اور ہر شخص نفرت و انتقام کے جذبے میں اندھا ہو چکا تھا۔ منگمری (موجودہ ساہیوال) کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہی وہ خطہ تھا جہاں بیدی صاحب پیدا ہوئے، جہاں ان کی جائیدادیں تھیں اور جہاں سے تقسیم کے وقت انہیں سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی۔ تاہم ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی محرومیوں کا ذکر شکایت کے انداز میں نہیں کیا بلکہ اس عہد کے اجتماعی المیے کو انسانی ہمدردی کے جذبے کے ساتھ بیان کیا۔ وہ اپنے نقصان پر رونے کے بجائے دوسروں کے دکھ کو کم کرنے کی فکر میں رہے۔ انھوں نے مہاجرین کی آباد کاری، مسلمانوں کو بحفاظت پناہ گزین کیمپوں تک پہنچانے، اور لوگوں کے چھوڑے ہوئے سامان کی حفاظت جیسے نازک کام نہایت ذمہ داری سے انجام دیے۔ یہ سب وہ عملی مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سیاسی شعور محض نظریاتی نہیں بلکہ عملی نوعیت کا بھی تھا۔

یہ کہنا بجا ہے کہ "یادوں کا جشن" ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں سیاسی حالات محض پس منظر نہیں بلکہ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ بیدی صاحب نے تقسیم کے سیاسی و سماجی تناظر کو جس طرح اپنی زندگی کے تجربات کے ساتھ جوڑا ہے، وہ اردو سوانحی ادب میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں آزادی کی تحریک، برطانوی اقتدار کے آخری دنوں کی سیاسی کشمکش، جنگِ عظیم دوم کے اثرات اور تقسیمِ ہند کے بعد کے فسادات جیسے اہم تاریخی و سیاسی واقعات کو ذاتی تجربے کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ صرف ایک سرکاری افسر کے طور پر نہیں بلکہ ایک باشعور ہندوستانی کے طور پر لکھتے ہیں جو اپنے عہد کے تضادات کو بخوبی سمجھتا ہے۔ ان کی تحریر میں ہمیں یہ احساس بار بار ملتا ہے کہ سیاست صرف اقتدار کا کھیل نہیں بلکہ انسانیت اور سماجی ذمہ داری سے جڑا ہوا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی صاحب کی آپ بیتی اردو ادب میں ایک ایسی نمایاں مثال ہے جہاں سیاسی حالات ذاتی زندگی کے ساتھ گندھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور قاری یہ دیکھتا ہے کہ ایک فرد کی زندگی دراصل پورے عہد کی سیاسی تاریخ کا عکس بن جاتی ہے۔

مہندر سنگھ کی آپ بیتی کے متعلق محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی رقم طراز ہیں:

"کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی ہمہ گیر دل پذیر اور تاثیر زندگی کے دلچسپ سوانح کا گلدستہ "یادوں کا جشن" ہے۔ یہ خود نوشت لطافت آمیز سادگی اور ظرافت انگیز برجستگی کا نمونہ ہے۔ اس دلچسپ کتاب میں شعر و شاعری، شکار کے تذکروں کے علاوہ اور بہت سے ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جن میں سیرت و کردار کی ستم ظریفیوں اور انسانی فکر و نظر کی مکمل تصویر ہے۔" (۹)

مہندر سنگھ بیدی نے اپنی آپ بیتی "یادوں کا جشن" میں تقسیمِ ہند کے دوران ہونے والی قتل و غارت کو ایک ایسے المیے کے طور پر پیش کیا ہے جو کسی ایک مذہب یا قوم تک محدود نہیں تھا بلکہ پورے برصغیر کی انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ یہ فسادات کسی خاص خطے یا مخصوص دن کے نہیں تھے بلکہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پھیلتے جا رہے تھے۔ بیدی صاحب نے نہایت غیر جانب دارانہ انداز میں اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ جس طرح مسلمانوں نے جانی و مالی نقصان اٹھایا، اسی طرح ہندو اور سکھ بھی انتقام، خوف اور جدائی کے درد سے گزر رہے تھے۔ ان کی تحریر میں کئی ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں جو انسانی دکھ کی یکساں نوعیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک واقعہ میں وہ اس وقت کے حالات کی سنگینی یوں بیان کرتے ہیں کہ بعض علاقوں میں مسلمانوں کی جان بچانے کے لیے مساجد کو عارضی پناہ گاہوں میں تبدیل کیا گیا اور ان کی حفاظت کے لیے مساجد خالی کروائی گئیں تاکہ فساد کی ان مقدس مقامات کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ یہ

عمل دراصل اس بات کی علامت تھا کہ مذہبی تفریق کے باوجود انسانیت کا جذبہ زندہ تھا۔ بیدی صاحب نے ایسے مناظر کو محض تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی سبق کے طور پر پیش کیا ہے کہ جب نفرت اپنے عروج پر ہو تو بھی انسانیت اپنی جگہ قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ کوئی اس کو بیدار رکھنے والا موجود ہو۔

"مسجدیں خالی کراتے وقت رفیوجی ہم سے یہ کہا کرتے تھے کہ کیا آپ کو علم نہیں کہ پاکستان میں ہمارے مندروں اور گوردواروں کا کیا حشر ہوا ہے اور یہ کہ مندروں میں گائیں ذبح کی جاتی رہی ہیں اور مورتیوں پر فضلہ اور گوبر پھینکا جاتا رہا ہے اس کا جواب ہمارے پاس صرف یہ ہوتا تھا کہ اگر وہ غلطی کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ ہم بھی اسی غلطی یا جرم کے مرتکب ہوں۔" (۱۰)

تقسیم ہند کے بعد برصغیر کے مختلف حصے آگ و خون کے سمندر میں ڈوب چکے تھے۔ ہر طرف بد امنی، خوف، انتقام اور نفرت کا دور دورہ تھا۔ ایسے حالات میں انسانیت پس منظر میں جا چکی تھی اور مذہبی و لسانی تعصبات نے ہر دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ لیکن مہندر سنگھ بیدی سحر نے اس خونی منظر نامے میں ایک مختلف کردار ادا کیا۔ انھوں نے قوم یا مذہب کے بجائے انسانیت کو اپنا نصب العین بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ تقسیم کا زخم محض جغرافیائی نہیں بلکہ انسانی ضمیر پر لگا ایک دائمی ناسور ہے۔ اسی لیے انھوں نے جذباتی ردِ عمل کے بجائے حکمت و تدبیر سے امن کی راہ اختیار کی۔ بیدی صاحب کے نزدیک امن محض نظریاتی نعرہ نہیں بلکہ ایک عملی فریضہ تھا، جسے انھوں نے اپنی زندگی کے ہر موڑ پر نبھایا۔

فسادات کے دوران جب قتل و غارت، لوٹ مار، اور انتقام کی آگ نے شہروں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا، تب بیدی صاحب نے نہایت دانشمندی سے حالات کو قابو میں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ انار کی کو ختم کرنے کے لیے صرف نصیحت کافی نہیں، بلکہ تدبیر اور عمل دونوں ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جہاں سختی کی ضرورت محسوس کی وہاں گرفتاریوں کے ذریعے فساد پھیلانے والوں کو روکا، اور جہاں سمجھانے کی ضرورت تھی وہاں انسانیت کے جذبے سے کام لیا۔ ان کی یہی غیر جانب دارانہ اور جرات مندانہ پالیسی تھی جس کی بدولت حکومت ہند نے انھیں پنجاب سے بلا کر دہلی کا نظم و نسق سنبھالنے کی ذمہ داری سونپی۔ دہلی اس وقت سب سے زیادہ متاثرہ شہر تھا، لیکن بیدی صاحب نے اپنے عزم، حوصلے اور تدبیر سے اس شہر کو امن کی راہ پر گامزن کیا۔ دہلی کے مسلمان بھی ان کی ایمانداری اور عدل پر اعتماد رکھتے تھے، اسی لیے خود انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اگر دہلی میں سکون قائم رکھنا مقصود ہے تو اس کی باگ مہندر سنگھ بیدی کے سپرد کی

جائے۔ ان کے کردار نے یہ ثابت کیا کہ انسان اگر نیت صاف رکھے تو وہ تعصب اور نفرت کے طوفان میں بھی انسانیت کا چراغ روشن رکھ سکتا ہے۔

"دہلی کا نظم و نسق برہم ہو چکا تھا۔ شدید فسادات ہوئے۔ بہت سے مسلمان قتل ہوئے۔ کچھ ایسے محلوں میں منتقل ہو گئے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ جن کو کہیں اور پناہ نہ مل سکی وہ پرانے قلعے کے ریوجی کیمپ میں چلے گئے۔ میرے بہت سے ملنے والے دہلی چھوڑ چکے تھے اور دہلی میں حالات بھی ایسے ہو چکے تھے جن کے سدھرنے کی کوئی فوری امید نہیں تھی۔" (۱۱)

درج بالا اقتباس سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مہندر سنگھ بیدی سحر جیسے انسان دوست اور امن پسند شخصیت کو بھی تقسیم ہند کے بعد فوری طور پر امن و استحکام کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ دور ایسا تھا جب فضا میں نفرت اور انتقام کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں اور انسانیت کا وجود خون کے سیلاب میں دب کر رہ گیا تھا۔ مگر بیدی صاحب کا نظریہ اس شورِ قیامت میں بھی انسانیت کی شمع کو روشن رکھنے کا تھا۔ وہ امن کو صرف ایک نظریہ نہیں بلکہ انسانی بقا کی بنیادی شرط سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب، نسل یا قوم سے بالاتر ہو کر انسان کا اصل فرض یہ تھا کہ وہ محبت، عدل اور رواداری کو فروغ دے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ امن کے قیام کی جدوجہد میں گزرا کبھی سرکاری حیثیت میں اور کبھی ذاتی طور پر۔ دہلی تباہی کے دہانے پر تھی، خون، خوف اور بد اعتمادی نے لوگوں کو پاگل کر دیا تھا مگر بیدی صاحب نے اپنے عزم و ایمان سے حالات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔ وہ نہ صرف حکومتی سطح پر امن کے اقدامات کرتے بلکہ عملی طور پر خود میدان میں اترتے۔ گلی گلی جا کر لوگوں کو سمجھاتے، اعلان کرتے اور تاکید کرتے کہ کوئی شخص تخریب کاری یا انتقامی کارروائی میں شریک نہ ہو، کیونکہ امن کی فضا قائم کیے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ ان کی تحریروں اور خودنوشت میں یہ منظر نہایت جاندار انداز میں سامنے آتا ہے جہاں وہ دہلی کے بگڑے ہوئے حالات کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے ایک ایسے انسان کی جھلک دکھاتے ہیں جو افراتفری کے بیچ بھی انسانیت کا قافلہ تھامے کھڑا ہے۔ ان کی یہ کوشش صرف وقتی اصلاح نہیں بلکہ ایک ایسی فکری جدوجہد تھی جو یہ باور کراتی ہے کہ امن ایک نظریہ نہیں، بلکہ ایک مسلسل عمل ہے جس کے لیے قربانی، صبر اور تدبیر لازمی ہیں۔

"میں نے پبلیٹی وین میں بیٹھ کر سارے شہر کا چکر لگایا اور اعلان کیا کہ اگر رات کے وقت کہیں سے کوئی نعرہ اٹھاتا تو میں اس مکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ یہ بھی اعلان کیا کہ لوگ اپنے اپنے محلوں اور گلیوں میں پہرہ دیں اگر کسی جگہ خنجر زنی کی کوئی واردات ہو گئی تو میں ارد گرد کے جتنے گھروں والے ہیں سب کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دوں گا۔" (۱۲)

مہندر سنگھ بیدی نے امن قائم کرنے کے لیے نرم دلی اور قوت ارادی کا ایسا امتزاج اپنایا جو حالات کا رخ بدل دینے کی سکت رکھتا تھا۔ وہ خود سڑکوں پر نکل آتے، اعلان کرتے اور صاف الفاظ میں بتا دیتے کہ شور شرارت برداشت نہیں کی جائے گی اور امن بگاڑنے والوں کو رعایت کا حق نہیں دیا جائے گا۔ ہر محلے کو اپنی حفاظت کی ذمہ داری سونپ دی گئی اور عوام سے کہا گیا کہ وہ پہرہ دیں تاکہ کسی بھی مشکوک حرکت کو فوراً روکا جاسکے۔ ساتھ ہی بیدی نے واضح کر دیا کہ اگر خنجر زنی یا خونریزی جیسی وارداتیں ہوئیں تو روایتی نرم رویے ترک کر کے قریبی مکینوں کو وقتی طور پر حراست میں لیا جائے گا تاکہ اصل مجرم تک پہنچا جاسکے۔ اس عملی حکمت عملی نے نہ صرف تخریب کاروں کو خوفزدہ کیا بلکہ عام لوگوں میں اس بات کا شعور بھی پیدا کیا کہ امن کی حفاظت سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے سخت قدم اٹھانے پڑ سکتے ہیں

ان کی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ بغیر کسی کو نقصان پہنچائے انھوں نے شہر میں امن قائم کیا۔ کوئی خون ریزی نہیں ہوئی، تقسیم کے دوران جو انسانیت کا خون بہایا گیا اس کے بعد کوئی ذی شعور انسان نہیں چاہتا تھا کہ امن قائم کرنے کے لیے کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے جو لوگوں کے لیے نقصان کا باعث بنے۔ بیدی صاحب نے پر امن اقدامات کیے۔ امن قائم کرنے کی اس تحریک میں انھوں نے تفریحی تقریبات کا سلسلہ بھی شروع کیا تاکہ لوگ اس طرف مصروف ہوں گے تو تخریب کاری کے مواقع کم سے کم ہوں گے۔ انھوں نے اس مد میں ہر وہ کام کیا جو عوام کے لیے مفید تھا۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف تقاریب منعقد کروائیں جن میں سے کچھ کا ذکر ذیل میں کیا جائے گا۔ آپ بیتی سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر لوگوں کا دل بہلتا رہے تو تخریبی کاموں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں دو باتوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جو ہمیشہ دہلی والوں کی تفریح کا باعث ہوتی رہی ہیں۔ دہلی کی ادبی اور کلچرل تاریخ شاہد ہے کہ مغلیہ دور سے ہی یہاں مشاعروں اور ادبی محفلوں سے امراء اور عوام دل بہلایا کرتے تھے۔ مرغ بازی، تیر بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی کا ذوق بھی عام تھا۔ چنانچہ میں نے مشاعروں کا، مرغ اور تیر لڑانے کا خاص طور پر اہتمام کیا۔ مقصد دراصل یہ تھا کہ ہندو مسلم سکھ، عیسائی سبھی مذہب کے لوگ پھر سے ایک جگہ اکٹھا ہو کر تفریح کریں تاکہ فرقہ وارانہ فسادات نے جو گہرے گھاؤ لگائے تھے مندرمل ہوں۔ دقت صرف اتنی تھی کہ ان کو کہاں اکٹھا کیا جائے، میں نے سب سے پہلے اپنی جائے رہائش واقع تیس ہزاری میں ہی یہ تیر، بٹیر مرغ، مینڈھے لڑانے کا سلسلہ شروع کیا۔" (۱۳)

مہندر سنگھ بیدی نے اپنے دور کے سبھی سیاسی واقعات کو تحریر کیا۔ جس میں انھوں نے وہاں کے حالات و واقعات کو ہر پہلو سے بیان کیا ہے۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کس قدر امن قائم کرنے کے متعلق سنجیدہ تھے۔ انھوں نے جو بھی کیا اس دوران وہ صرف ملک میں امن قائم کرنے کے لیے کیا اور جب تقاریب کے لیے کوئی جگہ نہ ملی تو انھوں نے اپنی رہائش گاہ میں ہی سارے انتظامات کیے۔ مقصد صاف ظاہر تھا کہ لوگ فرقہ واریت سے باہر نکلیں ایک دوسرے کو انسان سمجھیں اور آپس میں میل جول رکھیں۔ ان کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ ان حالات میں جب لوگ سہمے ہوئے اپنی رہائش گاہوں میں چھپے بیٹھے تھے انھوں نے آپس میں میل جول بڑھانا شروع کیا اور وہ گلی محلوں تک آنے لگے اور یوں شہر کی فضا میں ہمواری آنا شروع ہوئی۔ یہی نہیں تھا بلکہ بیدی صاحب کے ان اقدامات کی وجہ سے ان لوگوں کا بھی یقین بحال ہوا جو اپنے گھر چھوڑ کر کہیں آس پاس جا کر پناہ گزین ہوئے تھے وہ بھی اپنے گھروں کو واپس لوٹنا شروع ہو گئے۔

نارنگ ساقی صاحب نے مہندر سنگھ بیدی کے متعلق ایک کتاب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر-فن اور شخصیت کے عنوان سے مرتب کی ہے جس میں مہندر سنگھ کے بہت سے دوست احباب کے مضامین شامل ہیں۔ ان کا مطالعہ کر کے معلوم ہوتا ہے کہ بیدی صاحب امن پسند انسان تھے۔ ہر جگہ صلح کی بات کرتے تھے۔ اتحاد و اتفاق کی بات کرتے تھے۔ یہی رویہ ان کا دورانِ ملازمت بھی دیکھنے کو ملتا تھا۔ وہاں کے سیاسی حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے بیدی یہی مصالحت کا طریقہ اپناتے تھے۔ شریف الحسن نقوی نے بیدی صاحب کے انتظامی امور کے متعلق بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"کنور صاحب تقریباً ۳۴ سال سرکاری ملازمت میں رہے اور آزادی وطن کے بعد بھی بیس اکیس سال ذمہ دارانہ خدمات انجام دیں۔ گویا دو ایسے زمانے ان کے دورانِ ملازمت میں آئے جن کے تقاضے ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے لیکن ان دونوں مختلف المزاج ادوار میں ان کے جن اوصاف نے عوام و خواص دونوں میں محبوب و محترم رکھا، وہ تھی ان کی خاندانی شرافت، وجاہت، ایمانداری، فرض شناسی، انصاف پسندی، راست گوئی، مستعدی اور ساتھ ہی ساتھ معاملہ فہمی اور انتظامی صلاحیت۔" (۱۴)

بیدی صاحب کس قدر امن قائم کرنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ شریف الحسن نقوی ان لوگوں میں سے ہیں جو کنور صاحب کو بہت قریب سے جانتے تھے ان کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کی انتظامی صلاحیتوں کو ان کے دوست احباب بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے دہلی

میں اور مجموعی طور پر جو سارے شہروں میں امن قائم کرنے کی تحریک چلائی اور پھر اس میں حکمت عملی اور معاملہ فہمی سے کام لیا۔ شریف الحسن نقوی مزید قلم طراز ہیں:

"کنور صاحب نے جس وقت یہ تدابیر اختیار کیں ملک ایک ہنگامی دور سے گزر رہا تھا اور فضا بارود کی طرح اشتعال پذیر تھی، ایسی فضا میں بھی یہ تدابیر موثر ثابت ہوئیں۔ ایک طرف عام شہریوں پر ان کی کوششوں کے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے اور ان میں احساس شہریت بیدار ہوا۔ دوسری طرف حکام بالانے بھی ان کی حکمت عملی کا لوہا مانا۔ اب فضا بالکل بدل چکی ہے پھر بھی اس سلسلے کے تمام واقعات جن کا بیان "یادوں کا جشن" میں آیا ہے۔ اس لائق ہیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو اور ہمارا آج کا انتظامیہ چشم بصیرت واکر کے ان کا مطالعہ کرے۔" (۱۵)

بیدی صاحب کا سیاسی شعور اور انتظامی صلاحیتیں اس قدر پختہ تھیں کہ ان کے دوست احباب کے نزدیک ان کی انتظامی صلاحیتوں کا مطالعہ ہر اس انسان کو کرنا چاہیے جو انتظامی امور سے تعلق رکھتا ہے تاکہ اس کو یہ اندازہ ہو کہ انتظامی کام سرانجام دینے کا طریقہ کیا ہے اور کیسے ہنگامی حالات میں بھی معاملات سے نمٹا جاسکتا ہے۔

تقسیم برصغیر کے بعد کوئی ایک معاملہ نہیں تھا جس کو سمیٹنا تھا بلکہ ایسے اور بھی مسائل تھے جن میں سے ایک اہم اور بڑا مسئلہ ریفوجیوں کی رہائشوں کا تھا۔ ریفوجی پاکستان سے ہجرت کر کے گئے تھے ان کے جذبات مشتعل تھے ایسے میں ان پر حکم صادر کرنا ان کے لیے ظلم بھی تھا اور اپنے لیے بھی ایک خطرہ مول لینے والی بات تھی۔ ان کو محبت اور دلا سے کی ضرورت تھی اور انتہائی پر امن طریقے سے ان کو رہائش دینے کا کام کرنا تھا یہ کام بھی بیدی صاحب نے بہت احتیاط سے کیا۔

"پرانے قلعہ سے لوگوں کو گھروں سے واپس لانے میں ایک دقت یہ بھی تھی کہ جب وہ لوگ پرانے قلعہ میں گئے تو ان میں سے کئی لوگوں کے گھروں پر پاکستان سے آئے ہوئے ریفوجیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اب یہ لوگ بھی تباہ اور برباد ہو کر آئے تھے اور دہلی میں جہاں کہیں بھی کوئی مکان خالی ملا اس میں گھس گئے۔ ادھر حکومت کے پاس نہ تو نئے مکان موجود تھے جن میں ان کو بسایا جاتا اور نہ ہی اب تک اس طرف دھیان دینے کا موقع ملا۔ کیونکہ کشت و خون کو بند کرنا سب سے زیادہ ضروری اور فوری توجہ کا مسئلہ تھا۔" (۱۶)

پاکستان سے گئے ہوئے رفیوجیوں نے وہاں خالی مکان یا خالی مساجد دیکھیں تو وہیں جا کر پناہ لینی شروع کر دی۔ جو لوگ اپنے گھر چھوڑ کر فسادات کے دوران پرانے قلعے میں جا کر پناہ گزیں ہوئے تھے ان میں اکثر مسلمان تھے۔ پہلے وہاں کے مقامی لوگوں کو اپنے گھروں میں منتقل کرنا تھا اور اس کے بعد رفیوجیوں کے معاملے کو دیکھنا تھا لیکن رفیوجی خالی مکانوں میں قبضہ کر چکے تھے اور اب وہاں کے مقامی لوگوں کے لیے رفیوجیوں سے گھر خالی کرانے کا مسئلہ درپیش تھا جو کہ آسان نہیں تھا۔ بیدی صاحب نے اس مسئلے پر غور کیا اور رفیوجیوں سے گھر خالی کروانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جب اس کمیٹی نے کام کرنا شروع کیا تو ان کو گالیاں بھی سننے کو ملیں اور اس طرح سے بہت سے دوسرے رویے بھی برداشت کرنے پڑے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کمیٹی میں آخر میں تین سے چار لوگ ہی بچے جنہوں نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

یہ ایسے مسائل تھے جن کو نہایت سنجیدگی سے حل کرنے کی ضرورت تھی۔ رفیوجیوں نے مساجد میں اور مقامی لوگوں کے گھروں میں قبضہ کر لیا جب ان سے وہ جگہیں خالی کرنے کو کہا جاتا تو وہ کہتے کہ پاکستان میں ہماری عبادت گاہوں کا احترام نہیں کیا گیا ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں روا رکھا گیا اسی وجہ سے وہ باآسانی جگہیں خالی نہیں کرتے تھے۔ لیکن دو سے تین ماہ کی کاوشوں سے ان کے یہ مسائل بھی حل کر دیے گئے۔ ان کے لیے روزگار کے مسائل حل کیے گئے اور ان کو مکانوں تک منتقل کر دیا گیا۔ تقسیم برصغیر سے لے کر رفیوجیوں کو رہائشوں تک منتقل کرنے میں مہندر سنگھ بیدی ہر دم پر امن طریقے سے معاملات کو سنبھالتے رہے اور ہر سوا امن اور اتحاد کا اپنے عمل کے ذریعے پیغام دیتے رہے کہ حالات جیسے بھی ہوں اگر انسان چاہے تو ہر حال میں امن قائم بھی کر سکتا ہے اور معاملات کو پر امن طریقے سے حل بھی کر سکتا ہے۔ مہندر سنگھ کے سیاسی شعور میں اول تا آخر اتحاد اور امن ہی نظر آتا ہے کہ ہر سوا امن قائم رہے اور انسانیت آپس میں متحد رہے۔ یہی ان کا زندگی کا طریقہ تھا اور یہی ان کا سیاسی شعور کے لحاظ سے نظریہ تھا۔ ان کے رویے اور ذمہ داریوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سیاسی شعور کس قسم کا تھا برصغیر کی تقسیم سے پہلے اور بعد کے حالات میں انہوں نے کس طرح سے معاملات کو سنبھالے رکھا اور ہر ممکن غیر جانبداری سے کام کرتے رہے اور امن اور اتحاد کا پیغام دیتے رہے۔ یہ حالات و واقعات تب کے تھے جب برصغیر تقسیم ہوا اور اس کے بعد جو مسائل سامنے آئے ان کو حل کیا گیا۔

برصغیر تقسیم ہو گیا۔ اس کے بعد جو دو ملک وجود میں آئے مہندر سنگھ بیدی ان ممالک کے آپس کے تعلقات کے متعلق بھی بہت سنجیدہ تھے۔ یعنی بھارت اور پاکستان کے معاملے میں بھی مہندر سنگھ بیدی امن و اتحاد چاہتے تھے۔ ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات خوشگوار رہیں۔ انہوں نے

پاکستان میں متعدد بار مشاعرے کروائے اور ان مشاعروں میں دونوں ممالک کے شعراء کو مدعو کیا اس عمل میں بھی ان کا یہی مقصد کارفرما تھا کہ ان دو پڑوسی ممالک میں اتحاد رہے۔ اسی نسبت سے مہندر سنگھ بیدی نے اپنی آپ بیتی کا انتساب بھی ہندوپاک دوستی کے نام کیا ہے۔ اس معاملے میں وہ اپنی آپ بیتی میں کہتے ہیں:

"ویسے تو دنیا کے ہر ملک کا کوئی نہ کوئی پڑوسی ملک بھی ہوتا ہے اور اگر پڑوسیوں کے تعلقات اچھے ہوں تو دونوں ملکوں کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن بھارت اور پاکستان کے تعلقات ایک دوسرے پر شدید اثر ڈال سکتے ہیں۔ میری رائے میں دنیا میں کوئی ایسے دو پڑوسی ملک نہیں جو ایک دوسرے کو اس قدر فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہوں۔" (۱۷)

مصنف نے پاکستان اور بھارت کے تعلقات کی اہمیت اور ان کے باہمی اثرات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ دنیا کے ہر ملک کے کچھ نہ کچھ ہمسایہ ممالک ہوتے ہیں اور اگر ان کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہوں تو دونوں کو ترقی، امن اور معاشی خوشحالی کے مواقع میسر آتے ہیں۔ تاہم، بھارت اور پاکستان کے تعلقات اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ یہ دونوں ممالک ایک دوسرے پر نہ صرف سیاسی و معاشی بلکہ جذباتی اور تہذیبی طور پر بھی گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ ان کے درمیان دوستی خطے میں امن، تجارت اور ترقی کا باعث بن سکتی ہے جبکہ دشمنی یا کشیدگی دونوں کے لیے تباہ کن نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

پاکستان کے بارے میں بات کرتے ہوئے مہندر سنگھ بیدی اپنی آپ بیتی میں بیان کرتے ہیں:

"میں کئی بار پاکستان گیا ہوں اور ہر بار مجھے پیار ملا ہے۔ عوام سے ملا ہوں اداسے گفتگو کی ہے۔ دانشوروں سے تبادلہ خیالات ہوا ہے۔ بعض اوقات حکومت کے اراکین سے بھی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ہر جگہ میں نے آپس میں مل جل کر رہنے اور تعلقات کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنانے کے جذبہ کو تروتازہ پایا ہے۔" (۱۸)

مہندر کنور سنگھ بیدی کو پاکستان اور بھارت کے اتحاد میں کس قدر دلچسپی تھی۔ اس عوام دوستی کے پیغام کے بارے میں محمد شہاب الدین رحمانی نے لکھا ہے:

"بیدی نے اپنی خودنوشت کا انتساب عام مصنفین کی طرح اپنے کسی عزیز یا خاص رشتہ دار کی طرف نہ کر کے اس خوبصورت تصنیف کو ہندوپاک کے نام معنون کیا۔ وہ بھی "ہندوپاک دوستی کے نام" سے منسوب کر کے ہندوپاک کے عوام کو دوستی کا پیغام دیا۔" (۱۹)

مہندر سنگھ بیدی کے نزدیک امن اور اتحاد صرف نظریہ نہیں بلکہ زندگی کا عملی اصول تھے۔ وہ ہر موقع پر انسانیت، رواداری اور ہم آہنگی کے پیغام کو ترجیح دیتے اور اپنے فرائض میں بھی اسی سوچ کو برتتے رہے۔ ان کی گفتگو اور عمل دونوں میں انسان دوستی اور وسیع النظری کا مظاہرہ نمایاں نظر آتا ہے۔

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی اور زندگی دونوں میں گہرا سیاسی شعور جھلکتا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں تقسیم ہند، فسادات، ہندو مسلم تعلقات اور بین الاقوامی سیاست جیسے اہم تاریخی واقعات نہایت باریک بینی سے منعکس ہوئے ہیں۔ ان کا اسلوب نہ صرف بیانیہ کی روانی رکھتا ہے بلکہ اس میں فکری گہرائی اور تجربے کی ایک معتدل سیاسی بصیرت کی جھلک نمایاں ہے۔ وہ محض مشاہدہ کرنے والے نہیں بلکہ تاریخ کے فعال کردار تھے، جن کی تحریر میں جذبہ، حقیقت نگاری اور فکری توازن کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی یادوں کی برات میں سیاسی شعور:

جوش ملیح آبادی کی خودنوشت یادوں کی برات میں سیاسی مباحث کے تعلق سے دو گوشے موجود ہیں۔ ایک گوشہ عہد کے اعتبار سے ہے جس کے تحت ہندوستان کی تحریک آزادی اور جوش کے پاکستانی شہری بننے کے بعد وہاں کی سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرا گوشہ جوش کی سیاسی فکر اور سیاسی گلیاروں سے تعلقات کے مختلف پہلوؤں سے نسبت رکھتا ہے۔ آپ بیتی میں جگہ جگہ ایسے واقعات اور تاثرات موجود ہیں جن سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو سیاسی اتار چڑھاؤ دیکھے، ان کو بڑی بے باکی سے قلم بند کیا۔ آزادی کی تحریک ہو یا برصغیر میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے مسائل، جوش نے ان سب پر کھل کر اظہار کیا اور ہر موقع پر انسان اور انسانیت کو مقدم رکھا۔ ان کی تحریر میں بغاوت کا ایک ایسا ولولہ محسوس ہوتا ہے جو صرف الفاظ میں نہیں بلکہ ان کی سوچ کے ہر زاویے میں رچا بسا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ایک ایسے انسان کی داستان ہے جو اپنے عہد کے تضادات کو پہچانتا ہے اور ان کے خلاف فکری مزاحمت کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات کے ذریعے اس دور کی سیاست کے اندر چھپی منافقت، طبقاتی فرق اور اقتدار کی حرص کو بے نقاب کیا۔ وہ اپنے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ سیاست اگر انسانیت کے اصولوں پر قائم نہ ہو تو وہ تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی خودنوشت نہ صرف ایک شخصی بیان ہے بلکہ پورے عہد کا سیاسی مرقع بھی ہے۔

ریحانہ شاہین اس آپ بیتی میں موجود سیاسی صورتحال کے بارے میں لکھتی ہیں:

"جوش ملیح آبادی نے ہمعصر سیاسی صورتحال پر قلم فرسائی کرتے ہوئے جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت کا نقشہ کھینچا اور گاندھی کے قتل، تقسیمِ برصغیر، ہجرت، فسادات اور مہاجر شعرا ادبا کے ساتھ مقامی مصنفین کے رویوں پر روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ انھوں نے پاکستانی سیاست کا منظر نامہ بھی پیش کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ آپ بیتی عصری صورتحال کی ایک مکمل داستان ہے۔" (۲۰)

جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ایک عام سوانح عمری نہیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تاریخی حالات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی تاریخی اور سیاسی تبدیلیوں کو نہ صرف دیکھا بلکہ ان پر گہری بصیرت کے ساتھ اظہارِ خیال بھی کیا۔ ان کی تحریر اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ اپنے تجربات کے ساتھ ساتھ قوم اور معاشرے کے اجتماعی دکھوں اور تضادات کو بھی بیان کرتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی کی خودنوشت "یادوں کی برات محض ذاتی زندگی کا احوال نہیں بلکہ پاکستان اور برصغیر کے سیاسی و سماجی ارتقاء کی داستان بن جاتی ہے۔ وہ قاری کو بتاتے ہیں کہ ایک ادیب کا فرض صرف لکھنا نہیں بلکہ اپنے عہد کی سچائی کو بے خوفی اور دیانت داری کے ساتھ بیان کرنا ہے۔ ان کی آپ بیتی اس معنی میں ایک عصری تاریخی دستاویز ہے جو برصغیر کی سیاسی، فکری اور ادبی زندگی کی مکمل جھلک پیش کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت کو نہایت حقیقت پسندی سے پیش کیا، اس عہد کے سیاسی جبر، شخصی آمریت اور عوامی احساسات کو لفظوں میں ڈھالا۔ اس کے ساتھ ساتھ گاندھی کے قتل، تقسیمِ ہند، ہجرت، اور فرقہ وارانہ فسادات جیسے المناک واقعات کا ذکر کر کے انھوں نے برصغیر کے اجتماعی شعور کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ ان کی تحریر میں مہاجر شعرا و ادبا کے دکھوں اور مشکلات کا بھی ذکر ہے جو تقسیم کے بعد پاکستان آئے اور یہاں کے مقامی مصنفین کے رویوں کا سامنا کیا۔ جوش نے اس تلخ حقیقت کو نمایاں کیا کہ ادیب اور شاعر صرف الفاظ کے خالق نہیں ہوتے بلکہ معاشرے کی روح کے ترجمان بھی ہوتے ہیں۔

ایوب خان کے دورِ حکومت کا بیان کرتے ہوئے جوش کی زبان میں ایک خاص تلخی محسوس ہوتی ہے۔ وہ آمریت کے خلاف کھل کر بولتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اقتدار میں بیٹھے لوگ عوامی آزادیوں کو کس طرح دباتے ہیں۔ اُن کے الفاظ میں وہ تلخ تجربہ جھلکتا ہے جو ایک حساس ذہن کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ سچ بولنے کی سزا پاتا ہے۔ جوش کے نزدیک آزادی اظہارِ محض ایک حق نہیں بلکہ انسان کے وجود کا بنیادی تقاضا ہے اور جب یہ چھن جائے تو زندگی کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ اسی طرح وہ تقسیمِ ہند اور اُس کے نتیجے میں

ہونے والے فسادات کا ذکر کرتے ہوئے بہت درد محسوس کرتے ہیں۔ ان واقعات کو وہ تاریخ کے زخم نہیں بلکہ انسانیت کے زوال کی علامت سمجھتے ہیں۔ اُن کے بیانیے میں مذہب، سیاست اور طاقت کے گٹھ جوڑ پر تنقید کھل کر سامنے آتی ہے۔ جوش کے نزدیک مذہب کا استعمال اقتدار کے لیے ہونا انسان کی سب سے بڑی شکست ہے۔ گاندھی کے قتل کا ذکر اُن کے دل کی گہرائیوں سے اُٹھے دکھ کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ اسے محض ایک سیاسی سانحہ نہیں سمجھتے بلکہ ایک ایسے انسان کے خوابوں کا قتل قرار دیتے ہیں جو عدم تشدد اور امن کی بات کر رہا تھا۔ اس واقعے میں جوش کو وہ سچائی نظر آتی ہے کہ نظریے جب اقتدار کے سامنے آتے ہیں تو اکثر مصلوب کر دیے جاتے ہیں۔ یہ سب واقعات جوش کی آپ بیتی میں موجود ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں اس آپ بیتی کے بعد کئی سال مسائل کا سامنا بھی رہا لیکن وہ ڈٹ کر اُن حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔

"جوش ملیح آبادی کی خود نوشت یادوں کی برات ایک ایسی کتاب ہے جس کی اشاعت کے بعد ہندو پاک کے ادبی، سیاسی اور سماجی حلقوں میں زبردست واویلا مچا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ جوش کو ان کی خود نوشت کی وجہ سے بھی بہت شہرت حاصل ہوئی کیونکہ اس میں بہت ہی متنازع باتیں کہی گئی ہیں۔ یادوں کی برات سنہ ۱۹۷۲ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی اور جوش کا انتقال ۲۲ فروری سنہ ۱۹۸۲ء کو ہوا۔ ایک طرح سے وہ دس برسوں تک تنازعات میں گھرے رہے اور اس کے باعث انہیں بے حد دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ حکومت کے عتاب کے بھی شکار ہوئے۔" (۲۱)

ہجرت اور نئے وطن میں اجنبیت کا احساس بھی اُن کی تحریر کا اہم پہلو ہے۔ جوش کے لیے پاکستان آنا محض جغرافیائی تبدیلی نہیں بلکہ ایک روحانی جھٹکا تھا۔ وہ اپنے الفاظ میں اس تنہائی کو بیان کرتے ہیں جو اُس وقت کے بہت سے ادیبوں اور فنکاروں نے محسوس کی۔ ایک ایسی دنیا جہاں زبان، شناخت اور وابستگی سب نئے معنی اختیار کر گئے تھے۔

جوش ملیح آبادی کو انگریز سے سخت نفرت تھی اور انہوں نے اس کا برملا اظہار نہ صرف اپنی آپ بیتی میں کیا بلکہ ان کی شاعری بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کو انگریز سے شدید نفرت تھی اور ان کی بے باکی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کا اظہار کرنے سے کبھی کتراتے نہیں تھے۔ ہر ذی شعور انسان کی طرح وہ بھی یہ جانتے اور مانتے تھے کہ انگریز اپنے مفاد کے لیے ہندوستان میں موجود ہیں اور کسی طرح بھی وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ انگریز سے نفرت کے متعلق اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:

"ایک روز میں لکھنؤ کے نحاس والے مکان کی بالائی منزل کے برآمدے میں اپنی کھلائی بڑی بی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک سے دفعۃً تڑاق تڑاق کی آوازیں آئیں۔ بڑی بی نے جھک کر دیکھا تو زار زار رونے لگیں۔ میں نے پوچھا یہ بیٹھے بٹھائے رونے کیوں لگیں بڑی بی۔۔۔۔ انہوں نے روتے ہوئے کہا بیٹا مولا گاڑی والا گھوڑے کو چابک سے مار رہا ہے تڑاق تڑاق۔۔۔ ہائے ہمارے جان عالم بیبا کے زمانے میں ان گھوڑوں کو رئیسوں کی آبرو سمجھا جاتا تھا۔ ان کو دودھ جلیبی اور مٹھائی کھلائی جاتی تھی۔ جب سے ان بندر فرنگیوں کا راج ہوا ہے ان غازی مردوں کو چابکوں سے مارا جانے لگا ہے۔ بیٹا یہ غازی مرد کس قطار میں شمار ہیں ان بندروں کا جب سے دور دورا ہوا ہے۔ بڑے بڑے شریف زادے گلیوں میں جوتیاں چٹختے پھرتے ہیں۔ بڑی بی کی یہ بات سن کر میں بلبلایا اور فرنگی سے نفرت ہو گئی۔ اور وہی لڑکپن کی نفرت آگے چل کر میری سیاہی نظموں کے روپ میں شعلہ فشانہ کرنے لگی۔" (۲۲)

جوش کو ابتدا سے ہی انگریز سے سخت نفرت تھی اور اسی کے تحت ان کا سیاسی شعور پروان چڑھتا رہا۔ جس دور میں جوش پروان چڑھ رہے تھے اس وقت انگریز کا ہندوستان پر مکمل راج تھا اور وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بڑے ہوئے کہ انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ کیسا رویہ رکھتا ہے اور کس طرح انگریز نے ہندوستانیوں کو مظلوم اور غلام بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اسی نظریے کے تحت ان کو سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء سے بھی اختلاف تھا۔ جوش ملیح آبادی سیاسی لحاظ سے یہی نظریہ رکھتے تھے کہ انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کیا ہے اور ہندوستانیوں کو محکوم کر دیا ہے ان کے خلاف ہر ممکن جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ سرسید احمد خان اس نظریے کے قائل تھے کہ ہندوستانیوں کو انگریز کا تعلیم کے ذریعے مقابلہ کرنا چاہیے بالخصوص انگریزی زبان سیکھنے پر توجہ دینی چاہیے لیکن جوش ملیح آبادی اس کے برعکس سوچتے تھے۔ ان کو انگریز اور انگریزی دونوں سے شدید نفرت تھی۔ اسی بنا پر وہ سرسید احمد خان سے بھی اختلاف رکھتے تھے۔ اپنی آپ بیتی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"فرنگیوں کے نقیب پنڈت مدن موہن مالویہ اور سرسید احمد خان اپنے اپنے چلی چاڑوں کے ساتھ مغربیت کے فروغ کے لیے سعی کر رہے تھے۔ لیکن اس وقت مشرقیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ مغربیت ہر چند ابھرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ مگر قومی مشرقیت اس کا گلا دبائے ہوئے تھی۔" (۲۳)

جوش ملیح آبادی نے سرسید احمد خان کا ذکر واضح طور پر اپنی آپ بیتی میں کیا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ جوش کو مغربیت اور مغربیت اپنانے والوں سے سخت اختلاف تھا۔

"ہر چند سرسید گریزہ انگریزی خوانوں میں فرنگی کی نقالی اور پرستاری کا ذوق روہرتی تھا۔ مگر ان کی عورتیں ٹھیٹھ ہندوستانی تھیں۔" (۲۴)

جوش ملیح آبادی مشرقی روایات کو پسند کرتے تھے اور مشرقی روایات کے قائل تھے لیکن جو ہندوستانی مغربیت کو کسی بھی طرح سے پسند کرتا تھا تو اس سے ان کا اختلاف رہتا تھا۔ اس اختلاف کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ جن لوگوں نے ہمارا ملک ہم سے چھین لیا، ہمیں مظلوم بنادیا ان کی روایات کو نہیں اپنانا چاہیے اور اپنی روایات، اپنا طور طریقہ ان کو دیکھ کر ترک نہیں کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں جوش نے واقعات نقل کیے ہیں کہ کس طرح انگریز نے جس کو چاہا جیل میں ڈالا جس کو چاہا سولی پر لٹکا دیا۔ انگریزوں نے جس طرح ہندوستانیوں پر ظلم کیا اور ان کو آپس میں لڑوا دیا۔ اُن کی آپ بیتی سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"آخر کار حکومت نے ایک منصوبہ تیار کر لیا۔۔۔ پولیس اور فوج کے حلقے میں بگل بجا دیا گیا۔ ایک طرف تو جیلوں کے دروازے کھول دیے گئے لٹھیاں برسنے اور گولیاں چلنے لگیں۔ اور دوسری طرف پکڑ بلوایا گیا ہندوؤں اور مسلمانوں کے دینی رہنماؤں یعنی مہامہو پدھیاں اور شمس العلماءوں کو جن کو ہندو مسلم فسادات برپا کر دینے کے لیے برسوں سے گھر بیٹھے وظیفے مل رہے تھے۔" (۲۵)

ہندو مسلم فسادات کا موضوع تقریباً ہر ادیب اور مصنف کے ہاں موجود رہا ہے لیکن جوش کے ہاں اس موضوع کی واضح تصویر ملتی ہے۔ کیونکہ جوش ملیح آبادی نے جو دیکھا اور جس ماحول میں پرورش پائی اس کا مشاہدہ کیا اور اسی کے تحت ان کا یہ نظریہ پنپنا شروع ہوا کہ انگریز کسی طرح بھی ملک کے مفاد میں بہتر نہیں ہے۔ جنگ عظیم دوم میں اہل ہند سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ جنگ میں انگریز کی حمایت کریں اور ہندوستانی انگریز کے حق میں بولیں۔ انگریز کا یہ مطالبہ جوش ملیح آبادی کو بالکل پسند نہ آیا اور اس مطالبے کے سنتے ہی جوش نے "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" کے نام سے نظم لکھی جس میں انھوں نے انگریز کو وہ تمام مظالم یاد دلائے جو انھوں نے ابتدا سے اب تک ہندستان پر ڈھائے تھے۔ یہ نظم ان کی غم و غصے سے بھرپور تھی اور پھر یہ نظم ضبط کر لی گئی۔ جوش ملیح آبادی نے وہ نظم اپنی آپ بیتی میں نقل کی ہے تاکہ محفوظ رہے۔

"ایک روز جب میں اپنی بنارس باغ کے پھاٹک کے سامنے والی کوٹھی میں بیٹھا لکھنؤ کے گورنر کی تقریر ریڈیو پر سن رہا تھا جس میں اہل ہند سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ انسانیت کے مستقبل کو بچانے کی خاطر، جنگ عظیم میں، برطانیہ کی مدد پر کمر بستہ ہو جائیں۔ اس وقت میں نے یہ

مندرجہ ذیل نظم ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب کے نام سے پندرہ منٹ کے اندر کہہ ڈالی تھی۔

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری، اور یہ ذکر

نوع انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

جب، یہاں آئے تھے تم، سوداگری کے واسطے

نوع انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے

یہ نظم ضبط ہو جانے کی بناء پر میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکی ہے اس لیے اس کو یہاں درج کر رہا ہوں تاکہ محفوظ ہو جائے۔" (۲۶)

ان کی یہ نظم آٹھ بند پر مشتمل ہے جو کہ انتہائی غم و غصے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جوش ملیح آبادی نے نہ صرف زبانی کلامی انگریزوں کی مخالفت کی ہے بلکہ اپنی شاعری میں بالخصوص اس کا بڑھ چڑھ کر اظہار کیا ہے۔ اس کے عوض اُن کے ساتھ سخت رویہ بھی روا رکھا گیا لیکن وہ اپنے موقف سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔

جوش ملیح آبادی بنیادی طور پر ایک شاعر، مفکر اور انقلابی طبیعت کے انسان تھے جن کا قلم ہمیشہ حق گوئی اور انسان دوستی کا علمبردار رہا۔ اگرچہ وہ عملی طور پر سیاست کے میدان میں داخل نہیں ہوئے، مگر ان کی فکر اور نظریات میں سیاسی شعور کی روشنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران جب ہندو اور مسلمان ایک مشترکہ مقصد کے لیے متحد ہوئے، تو جوش نے بھی اسی اتحاد کی فضا میں ایک مختصر عرصے کے لیے تحریک آزادی سے وابستگی اختیار کی۔ اپنی خودنوشت میں اسی دور کو وہ "قومی تحریک سے وابستگی" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ ایک ایسا زمانہ جب قوم کی رگوں میں آزادی کا جوش رواں تھا اور فرقہ وارانہ حد بندیوں کی دیواریں ٹٹی جا رہی تھیں۔

جوش ملیح آبادی کے مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور دیگر قومی رہنماؤں سے گہرے تعلقات تھے، مگر ان کی طبیعت میں سیاست کا عملی مزاج نہیں تھا۔ وہ سچے معنوں میں ایک فکری انقلابی تھے جو سیاست میں شرکت سے زیادہ اس کے فکری اور اخلاقی پہلوؤں پر یقین رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد جب برصغیر فسادات کی آگ میں جھلنے لگا، تو جوش نے کسی سیاسی جماعت یا تحریک سے خود کو وابستہ نہیں کیا بلکہ انسانیت کے رشتے کو مقدم رکھا۔

ان کی آپ بیتی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے پر جوش حامی تھے۔ انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات میں جہاں بھی ان دو قوموں کا ذکر کیا، ہمیشہ باہمی اتحاد، رواداری اور یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ ان کے نزدیک انگریزوں کی سب سے بڑی سازش یہ تھی کہ انھوں نے صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایسی خلیج پیدا کر دی جو بعد میں ناقابلِ عبور ثابت ہوئی۔

جوش ملیح آبادی کی فکری و انقلابی زندگی کا یہ پہلو نہایت اہم ہے کہ ان کے سیاسی نظریات محض نظریاتی سطح تک محدود نہیں رہے بلکہ عملی زندگی میں بھی ان کی آزاد منش طبیعت اور حق گو مزاج نے انہیں بارہا نظام اور اقتدار کے خلاف صف آراء کر دیا۔ اگرچہ جوش بنیادی طور پر ایک فن کار اور ادیب تھے مگر ان کے اندر ایک ایسا باغی اور خوددار انسان بھی بستا تھا جو کسی بھی ظلم، جبر یا استحصالی قوت کے سامنے خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ جب حالات کی سختیوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ معاشی استحکام کی خاطر نظام حیدرآباد کے دربار سے وابستہ ہوں، تو وہ دل کی گہرائیوں سے اس فیصلے پر مطمئن نہ تھے۔ ان کی سرشت میں آزادی و خودداری کا جوہر اس قدر گہرا پیوست تھا کہ وہ کسی کے ماتحت رہ کر طویل عرصہ خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے۔ وہ خود اپنی آپ بیتی میں اعتراف کرتے ہیں کہ یہ وابستگی ان کے فطری مزاج کے خلاف تھی لیکن حالات کے جبر نے انہیں اس راہ پر چلنے پر مجبور کیا۔ تاہم ان کی انقلابی روح نے جلد ہی اپنی فطری راہ اختیار کی اور وہ زبان و قلم کے ذریعے اپنی بے باکی کا اظہار کرنے لگے۔

اسی بے باکی کا مظہر ان کی وہ مشہور نظم "غلط بخشی" ہے جو انھوں نے نظام حیدرآباد کے خلاف لکھی۔ اس نظم میں جوش نے نہ صرف درباری نظام کی منافقت، خوشامد اور ناانصافی پر تنقید کی بلکہ اس طبقاتی تفاوت کو بھی بے نقاب کیا جو عوام اور حکمران طبقے کے درمیان ایک خلیج بن چکا تھا۔ ان کے الفاظ میں وہ درد اور طنز دونوں کی کیفیت یکجا ہو گئی ہے۔ ایک ایسا لہجہ جو ان کے انقلابی مزاج کا غماز ہے۔

یہ نظم ان کی سیاسی سوچ اور اخلاقی جرات کا مظہر ہے۔ جوش کے لیے ادب محض حسن بیان کا نام نہیں تھا بلکہ وہ اسے سچائی کے اظہار اور ظلم کے خلاف احتجاج کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "غلط بخشی" جیسی نظم لکھنے کے بعد انھیں پہلے دربار سے، پھر خود حیدرآباد سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ مگر جوش کے نزدیک یہ قربانی شکست نہیں بلکہ ضمیر کی فتح تھی۔

"وہی نظم میرے اخراج کا سبب بن گئی لیکن اس نظم کی پشت پر جو اور اسباب بھی کام کر رہے تھے ان کا اب تک کسی کو علم نہیں ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب کو بھی

بیان کر دوں۔ مجھ کم بخت گھر بھونک تماشا دیکھنے والے کی یہ افتاد مزاج ہے خواہ اسے ہنر سمجھا جائے یا عیب کہ میں عامۃ الناس کے قدموں پر سر جھکا دینے کو انتہائی شرافت اور خداوندان اقتدار کے تخت کے روبرو گردن میں خم پیدا کرنے کو انتہائی کمینگی سمجھتا ہوں۔" (۲۷)

درج بالا اقتباس سے ایک توجوش کی خودداری کا اظہار ہوتا ہے اور سیاسی لحاظ سے یہ کہ حاکم عوام کو اور ملازموں کو ایسے نہ رکھے کہ جیسے وہ خدا ہوں۔

جوش ملیح آبادی نے جس طرح متحدہ ہندوستان کے بارے میں اپنی آپ بیتی میں بیان کیا اس نسبت سے انھوں نے تقسیم برصغیر کے متعلق ذکر نہیں کیا۔ ان کی زندگی میں آزادی کی متعدد تحریکیں چلی ہیں لیکن اس معاملے میں جوش اپنی آپ بیتی میں خاموش ہیں۔ سیاسی لحاظ سے ان کی آپ بیتی میں غالب موضوع صرف انگریزوں سے نفرت کا ملتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کے سیاسی شعور کو مزید دیکھیں تو ان کے ہاں سرمایہ داری نظام اور سوشلزم کے بارے میں بحث ملتی ہے۔ جوش ملیح آبادی اس ضمن میں سوشلزم کے حامی تھے اور وہ ہمیشہ چاہتے تھے کہ برصغیر میں سوشلسٹ حکومت بنے اور انھوں نے ان واقعات کا ذکر آپ بیتی میں بھی کیا ہے۔ سرمایہ داری نظام کی کھل کر مخالفت اور سوشلزم کی حمایت یہ وضاحت کرتی ہے کہ جوش ملیح آبادی سوشلزم کو ملک میں دیکھنا چاہتے تھے۔ دراصل سرمایہ داری یہ ہے کہ سارا معاشی نظام ایک ہی طبقے کے ہاتھ میں ہو، وہ طبقہ ہر چیز پر قبضہ رکھے۔ اس میں تجارتی ادارے اور کاروباری تمام معاملات شامل ہیں۔ اس نظام میں جو معاشرے کا نچلا طبقہ ہے وہ اعلیٰ طبقے کے ماتحت کام کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے اور محنت کے باوجود تنگ زندگی گزارتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے زیر اثر صرف ایک ہی طبقہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور باقی معاشرہ تنزلی کا شکار رہتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کی تاریخ کے متعلق سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ

"اس نظام کے تحت شہروں میں بڑے بڑے کارخانے اور تجارتی ادارے قائم ہوئے اور پیشہ ور برادریوں کے پرانے حلقے ٹوٹ گئے، چھوٹے چھوٹے کارخانوں اور منفرد کاریگروں اور چھوٹی پونجی والے دوکان داروں کے لئے دائرۂ زندگی تنگ ہو گیا۔ دیہات و قصبات کے پیشہ ور لوگ مجبور ہو گئے کہ شہروں میں آئیں اور ان بڑے کارخانہ داروں کے دروازے پر مزدور کی حیثیت سے جا کھڑے ہوں۔" (۲۸)

سوشلزم کا بنیادی مقصد اجتماعیت کا ہے کہ سب کے لیے جو آسان ہو۔ سوشلزم درحقیقت سرمایہ داری نظام کے رد عمل میں آنے والی تحریک تھی جس نے عام فرد کی بات کی اور عوام کو اہم سمجھا۔ سرمایہ

داری نظام انفرادی حیثیت کو اہم سمجھتا ہے اور سوشلزم اجتماعی طور پر اصلاح کی بات کرتی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی سوشلزم کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا نظام زندگی بنایا جائے جس میں بحیثیت مجموعی پورے اجتماع کی اصلاح ہو۔" (۲۹)

جوش ملیح آبادی کی فکر میں سوشلزم محض ایک سیاسی نظریہ نہیں بلکہ انسانی مساوات اور عوامی فلاح کا عملی تصور تھا۔ ان کے نزدیک سوشلزم وہ نظام تھا جس میں انسان کو اس کی محنت کے مطابق مقام ملتا ہے اور کوئی طبقہ دوسرے پر ظلم یا استحصال نہیں کرتا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایک صحت مند اور انصاف پر مبنی معاشرہ تب ہی وجود میں آسکتا ہے جب اقتدار، دولت اور وسائل چند ہاتھوں میں محدود نہ رہیں بلکہ سب کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم ہوں۔ یہی سوچ ان کے اس نظریے کی بنیاد بنی کہ عام آدمی ہی اصل طاقت ہے اور کسی بھی قوم کی ترقی عوام کی خوشحالی سے مشروط ہے۔

جوش کے نزدیک عوامی طبقے کی قربانیاں وہ ستون تھیں جن پر آزادی اور سماجی نظام قائم تھا، لیکن بد قسمتی سے یہی طبقہ اکثر اقتدار سے محروم اور حکمرانوں کے تسلط میں رہتا تھا۔ اس طبقاتی تفاوت کے خلاف جوش نے ہمیشہ آواز بلند کی۔ انھوں نے سرمایہ داری اور جاگیر دارانہ نظام کو عوام دشمن قرار دیتے ہوئے سوشلزم کو ایک ایسے معاشی و اخلاقی انصاف کے ضامن نظام کے طور پر دیکھا جو انسان کی عزت نفس اور محنت کی قدر کرتا ہے۔ اپنی خودنوشت میں بھی وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ سوشلسٹ طرز حکومت ہی وہ نظام ہے جس میں انسانیت کے وقار اور مساوات کی حقیقی روح زندہ رہ سکتی ہے۔

اگر جوش ملیح آبادی کے سیاسی شعور کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا بجا ہو گا کہ ان کے ہاں سیاسی شعور ضرور موجود ہے مگر وہ کسی گہرے یا مسلسل عملی سیاسی عمل میں ڈھلا ہوا نہیں۔ ان کے سیاسی افکار جذبات، انسان دوستی اور عدل پسندی سے بھرپور ہیں مگر وہ کسی منظم سیاسی فلسفے یا طویل سیاسی وابستگی کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئے۔ جوش کی سیاست شعوری سے زیادہ احساسی اور اخلاقی نوعیت کی ہے۔ وہ ظلم کے خلاف اور انصاف کے حامی ضرور تھے، مگر سیاسی پالیسیوں کے سطح پر ان کا ادراک محدود رہا۔ اس کے باوجود ان کے افکار میں اتنا ضرور ہے کہ یہ ثابت کریں کہ جوش صرف شاعر انقلاب نہیں بلکہ ایک باشعور فکری اور نظریاتی شخصیت بھی تھے جنھوں نے قلم کے ذریعے سیاسی بیداری میں اپنا کردار ادا کیا۔

"یادوں کا جشن" اور "یادوں کی برات" میں سیاسی شعور کا تقابل

جوش ملیح آبادی اور مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی کا مطالعہ کیا جائے تو سیاسی شعور کے لحاظ سے دونوں آپ بیتیوں میں اشتراکات اور افتراقات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اشتراکات

۱. یادوں کا جشن اور یادوں کی برات دونوں آپ بیتیوں میں سیاسی شعور کے لحاظ سے نظریہ اتحاد و امن کو فروغ دینے کا ذکر باقی موضوعات کی نسبت زیادہ ہے۔ دونوں مصنفین کے ہاں مسائل کا حل صرف اتحاد میں ہے۔
۲. دونوں مصنفین نے اپنی آپ بیتیوں میں برصغیر کی آزادی کی تحریک، ہندو مسلم اتحاد اور انگریز استعمار کے خلاف عوامی جدوجہد کا ذکر شدت اور احساس کے ساتھ کیا ہے۔
۳. دونوں آپ بیتیوں میں انگریزوں سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔
۴. دونوں ادیبوں نے اپنی فکری بنیاد میں بین المذاہب ہم آہنگی اور اتحاد کو ترجیح دی۔ یعنی جوش ملیح آبادی نے ہندو مسلم اتحاد کو آزادی کی واحد راہ قرار دیا۔ جبکہ مہندر سنگھ بیدی نے تقسیم کے بعد بھی امن و اخوت کی بحالی کے لیے اپنی سرکاری و سماجی خدمات کو وقف کیا۔
۵. ان دونوں کے ہاں سیاسی شعور مذہب سے بالاتر ہو کر انسانیت اور بقائے باہمی کے اصول پر استوار نظر آتا ہے۔
۶. دونوں مصنفین نے سیاست کو انسان دوستی کے نظریے سے وابستہ کیا۔
۷. دونوں مصنفین انگریز کے حکمانہ لہجے کو ناپسند کرتے ہیں اور ان کے آگے جھکنے سے انکار کرتے ہیں۔
۸. دونوں ادیبوں کی آپ بیتیوں میں سیاست اخلاقی بنیادوں پر قائم نظر آتی ہے۔ جوش کے نزدیک سوشلزم انسانیت اور مساوات کی علامت ہے۔ جبکہ بیدی کے نزدیک امن، اخوت اور انسانی فلاح سیاست کا اصل مقصد ہے۔
۹. دونوں مصنفین کی آپ بیتیوں میں قوم کی خدمت کا جذبہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

افتراقات

۱. یادوں کی برات میں انگریز اور انگریزی سے نفرت کا اظہار واضح الفاظ میں ہوا ہے جب کہ یادوں کا جشن میں اس طرح کا بے باکانہ اظہار نہیں دیکھا گیا۔
۲. مہندر سنگھ بیدی نے جتنے بھی واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے جب کہ جوش ملیح آبادی کے ہاں ان کی شخصیت کی طرح تحریر میں بھی باغیانہ رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔
۳. جوش ملیح آبادی سیاسی رہنماؤں کے بہت قریب رہے مگر ان کا سیاسی میدان میں عمل دخل بہت کم ملتا ہے اور بیدی کی ملازمت کا تعلق سیاسی اداروں سے رہا ہے جس بنا پر ان کو سیاست کے قریب رہنے کا بھی موقع ملا ہے۔
۴. مہندر سنگھ بیدی نے تقسیم ہند کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اپنی ہجرت، فسادات، قیام پاکستان، اس کے بعد کے مسائل اور ان کو حل کرنا ہر طرح کا ذکر کیا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے جب کہ جوش ملیح آبادی کے آپ بیتی میں تقسیم کے واقعات کا ذکر نہیں ہے صرف متحدہ ہندوستان کے واقعات کو بیان کیا ہے اور اس کے بعد جب وہ پاکستان ہجرت کر گئے تو وہاں کے آمرانہ دور کا ذکر کیا ہے۔
۵. بیدی کی آپ بیتی میں کہیں بھی تقسیم ہند کے حق میں یا اس کے خلاف کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن جوش کی آپ بیتی میں تقسیم ہند کے معاملے میں ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تقسیم کے حق میں نہیں تھے۔
۶. جنگ عظیم دوم کے دوران انگریز نے ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ ہندوستانی اس جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دیں اس کام میں بیدی صاحب کو ذمہ داری دی گئی کہ وہ لوگوں کو قائل کریں انھوں نے اس ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھایا اور اس میں بھی مقصد صرف یہ رکھا کہ ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد قائم ہو۔
۷. جوش ملیح آبادی نے انگریز کی اس اپیل پر "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" کے نام سے انگریزوں کے خلاف نظم لکھ ڈالی جو کہ ضبط کر لی گئی۔
۸. مہندر سنگھ بیدی نے آپ بیتی میں انڈیا اور پاکستان کے تعلقات پر بھی بات کی ہے کہ ان کے آپس میں تعلقات کیسے ہونے چاہیے، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے پڑوسی ممالک کے اچھے اور برے تعلقات کے فائدے اور نقصانات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔
۹. جوش کے ہاں پاک بھارت تعلقات پر کوئی ذکر نہیں ملتا۔

۱۰. جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی میں انگریزی سے نفرت کا بھی برملا اظہار ملتا ہے اور اردو سے محبت کا ذکر بھی ملتا ہے۔

۱۱. بیدی اردو زبان کے معاملے میں بہت حساس تھے اور انھوں نے اس موضوع پر بات بھی کی ہے، ان کی آپ بیتی میں انگریزی سے نفرت کا اظہار کہیں نہیں دیکھنے میں آیا۔

مجموعی طور پر جوش ملیح آبادی اور مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی میں اشتراکات اور افتراقات دونوں پائے جاتے ہیں۔ گو کہ دونوں کا تعلق ایک ہی عصر سے تھا لیکن دونوں کا اندازِ مخاطب اور اسلوب الگ الگ نوعیت کا تھا۔ کہیں نہ کہیں اگر خیالات نہیں ملتے تو نظریات کا ملاپ ہو جاتا ہے اور کبھی کبھار نظریات ایک ہوتے ہیں لیکن بیان کرنے کا انداز کہیں دھیمہ ہے تو کہیں جوش انداز میں۔ البتہ دونوں مصنفین کی آپ بیتیوں میں سیاسی شعور کا عکس ملتا ہے۔ مہندر سنگھ بیدی کے ہاں زیادہ نوعیت کے واقعات پائے جاتے ہیں جبکہ جوش کے ہاں سیاسی واقعات اور شعور موجود ہے لیکن اُس کی مقدار تھوڑی کم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں مصنفین نے الگ انداز سے اپنے عہد کے سیاسی حالات بیان کیے ہیں جس سے ایک عہد کے مختلف سیاسی پہلو سامنے آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. نارنگ ساقی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۰۔
۲. عمر جاوید، یادوں کا جشن : ایک منفرد آپ بیتی، (مضمون)، (جیونیوز، ۱۹ جولائی، ۲۰۱۷ء)
۳. ایضاً
۴. محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی، مونوگراف کنور سنگھ بیدی سحر، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۲۱ء)، ص ۲۳، ۲۴۔
۵. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، (جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۴۲۔
۶. ایضاً، ص ۱۴۲۔
۷. ایضاً، ص ۱۵۱۔
۸. ایضاً، ص ۱۷۶۔
۹. محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی، مونوگراف کنور سنگھ بیدی سحر، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۲۱ء)، ص ۸۔
۱۰. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، (جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۸۶۔
۱۱. ایضاً، ص ۱۸۱۔
۱۲. ایضاً، ص ۱۸۳۔
۱۳. ایضاً، ص ۱۸۳۔
۱۴. شریف الحسن نقوی، سید، "کنور مہندر سنگھ بیدی کی انتظامی صلاحیتیں" مشمولہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ فن اور شخصیت مرتبہ نارنگ ساقی، عقیل احمد (نئی دہلی: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریچر ٹرسٹ، ۲۰۲۳ء)، ص ۱۵۶۔
۱۵. ایضاً، ص ۱۶۰۔
۱۶. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، (جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۸۵۔
۱۷. ایضاً، ص ۵۰۸۔
۱۸. ایضاً، ص ۵۰۸۔
۱۹. محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی، مونوگراف کنور سنگھ بیدی سحر، ایضاً، ص ۲۵۔

۲۰. ریحانہ شاہین، ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتوں میں عصری شعور کا تقابلی مطالعہ، (اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، جون ۲۰۲۰ء)، ص ۳۱۔
۲۱. جوش ملیح آبادی، (مضمون)، آرٹ گیلری، فروری ۲۰۱۰ء
۲۲. جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، (کراچی: جوش اکیڈمی، ۱۹۷۲ء) ص ۱۱۰۔
۲۳. ایضاً، ص ۱۹۷۔
۲۴. ایضاً، ص ۲۰۰۔
۲۵. ایضاً، ص ۲۰۳۔
۲۶. ایضاً، ص ۲۶۸۔
۲۷. ایضاً، ص ۲۴۱۔
۲۸. ابو الاعلیٰ مودودی، سید، سرمایہ داری اور اشتراکیت، (دہلی: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، ۱۹۷۱ء) ص ۱۴۔
۲۹. ایضاً، ص ۴۱۔

باب سوم

یادوں کا جشن اور یادوں کی برات میں سماجی و
عصری حالات و واقعات کی پیش کش

باب سوم:

یادوں کا جشن اور یادوں کی برات میں سماجی و عصری حالات و واقعات کی پیش کش

سماج: تعارف

معاشرے میں موجود انسان کا رہن سہن، اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور اس کے طور طریقے سماج کہلاتے ہیں۔ ابتدائی زمانے کا انسان جنگلوں میں رہتا تھا کوئی معاشرتی نظام نہیں تھا کوئی نظم و ضبط نہیں تھا۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا تو انسانی عقل نے بھی ترقی کی اور اپنے رہن سہن کے معیار کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ انسان نے مل جل کر رہنا سیکھا ایک دوسرے کی ضرورت کو سمجھنا شروع کیا اور آپس میں تعلقات کو فروغ دیا اسی طریقہ کار نے سماج کو جنم دیا۔

فیر چائلڈ نے سماج کی تعریف یوں کی ہے کہ

"سماج انسانوں کا ایسا گروہ ہے جو اپنے بہت سے ضروری مقاصد، جن میں لازمی طور سے خود کی حفاظت یا پیٹ بھرنا ہے اور ان سب چیزوں کو پورا کرنے میں مدد دیتا ہے۔" (۱)

انسان باہمی ضرورتوں کے باعث ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ابتدا ہی سے سماج کی بنیاد انہی ضرورتوں کے تحت قائم ہوئی ہے۔ سماج دراصل افراد کا وہ مجموعہ ہے جس میں لوگ روایتوں اور اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ سماج افراد کے اجتماع سے ہی وجود میں آتا ہے اور فرد و سماج کے مابین گہرا تعلق قائم رہتا ہے۔ معاشرے کی بہتری یا زوال انسان ہی کے کردار سے وابستہ ہے کیونکہ جیسا فرد ہو گا ویسا ہی معاشرہ پروان چڑھے گا۔

معاشرہ اور انسان لازم و ملزوم ہیں اور انسان اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں کئی کارنامے انجام دیتا ہے جن کے لیے وہ دیگر انسانوں اور اپنے گرد و پیش کے ماحول سے رشتہ قائم رکھتا ہے۔ انسان اس دنیا کا ایک اہم جزو ہے جو مختلف عناصر سے تعلقات استوار کر کے زندگی کے دھارے کو رواں رکھتا ہے۔ انہی

تعلقات روایتوں اور اقدار کی بنیاد پر ایک منظم صورت اختیار کرتے ہیں اور انہی سے معاشرے کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے کے وجود کے ضامن ہیں اور انسان اس معاشرتی نظام میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ معاشرے کے بنیادی عناصر میں تہذیب و ثقافت کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ انہی کے ذریعے ایک معاشرہ دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے کیونکہ ہر معاشرے کی تہذیب و ثقافت اپنی نوعیت کے لحاظ سے جدا ہوتی ہے۔ جیسے جیسے تہذیب و ثقافت ارتقا پذیر ہوتی ہے معاشرہ بھی اسی تناسب سے ترقی کی منازل طے کرتا ہے اور اس میں مختلف تبدیلیاں جنم لیتی ہیں۔ اگر معاشرے کے افراد اخلاقی اقدار سے غافل ہو جائیں تو یہی ان کے معاشرے کی پہچان بن جاتی ہے۔ موجودہ دور میں منفی رویے اور بد اخلاقی ہماری اجتماعی شناخت بنتے جا رہے ہیں اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی طرز عمل ہی معاشرے کی صورت گری کرتا ہے۔

تہذیب و ثقافت انسان اور معاشرے دونوں کو راہ راست پر رکھتے ہیں اور جب یہ مذہب کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں تو ان میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان کا کسی بھی مذہب سے تعلق اس کے وجود کا حصہ بن جاتا ہے کیونکہ مذہبی اقدار ہر انسان کے لیے باعث احترام ہوتی ہیں۔ بہت سے معاشرے اپنے مذہب کے باعث پہچانے جاتے ہیں اور مذہب خود ان کی شناخت کا حصہ بن جاتا ہے۔ یوں مذہب معاشرتی تشکیل کے اہم ترین عناصر میں شمار ہوتا ہے۔ تہذیب و ثقافت اخلاقی اقدار اور مذہب وہ بنیاد ہیں جن پر معاشرہ قائم ہوتا ہے اور انہی سے اس کی فکری سمت متعین ہوتی ہے۔ معاشرے میں رائج اقدار اور روایات اس کے سماجی شعور کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور انہی کے زیر اثر معاشرتی صورت حال وجود میں آتی ہے۔

عصر: تعارف

عصر زمانے کو کہتے ہیں۔ زمانہ گزرا ہوا بھی ہو سکتا ہے اور موجودہ زمانہ یعنی حال بھی ہو سکتا ہے۔ مخصوص دور میں ایسے حالات و واقعات کا وقوع پذیر ہونا جو اس سے پہلے نہ پیش آئے ہوں وہ عصر کہلاتا ہے اور ان حالات و واقعات کو سمجھنا عصری شعور کہلاتا ہے۔ فیروز اللغات میں عصر کے معانی ہیں:

"زمانہ - وقت" جبکہ عصری کے معانی "زمانے سے نسبت رکھنے والی کوئی شے - زمانے کا

(کی) - (۲)

"زمانہ" یا "وقت" دراصل وہ بہتا ہوا تسلسل ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک ربط میں باندھتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا سب سے بنیادی اور ہمہ گیر عنصر ہے، جو نہ صرف تغیر و تبدل کا استعارہ ہے بلکہ تمام انسانی تجربات اور مشاہدات کا پس منظر بھی فراہم کرتا ہے۔ زمانہ ہر شے کو ایک معنویت عطا کرتا ہے، کیونکہ

اس کے بغیر کوئی وجود، کوئی حرکت اور کوئی احساس ممکن نہیں۔ یہی زمانہ جب انسانی شعور، فکر اور تجربے سے جڑتا ہے تو ادب میں "عصر" یا "عصریت" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

"عصری" دراصل اس کیفیت یا نسبت کا نام ہے جو کسی شے کو اپنے دور، اپنے وقت اور اپنے ماحول سے جوڑتی ہے۔ عصری کا مطلب ہے "زمانے سے نسبت رکھنے والا" یعنی وہ جو اپنے عہد کی ترجمانی کرے، جو اپنے وقت کے تقاضوں، رجحانات، مسائل اور فکری دھاروں سے ہم آہنگ ہو۔ ادب میں "عصری" لفظ محض زمانی وابستگی کا نہیں بلکہ فکری اور تخلیقی ہم زمانی کا استعارہ ہے۔ عصری تخلیق وہی کہلائے گی جو اپنے زمانے کے دکھ، سکھ، تضادات اور شعور کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو۔

"زمانہ" وقت کا وہ بہاؤ ہے جو وجود کو حرکت دیتا ہے، اور "عصری" وہ آئینہ ہے جو اس بہاؤ کی جھلک کو انسانی فکر اور فن کے قالب میں منعکس کرتا ہے۔ ادیب اور شاعر اپنے عصری شعور کے ذریعے اپنے زمانے کے احساسات و اثرات کو الفاظ میں ڈھالتے ہیں، اور یہی عمل ان کے فن کو زندگی، معنویت اور دوام بخشتا ہے۔

اردو ادب اپنے آغاز سے ہی زندگی کے مختلف رنگوں اور سماجی و تاریخی حالات کا مظہر رہا ہے۔ ہر دور میں ادیب و شاعر نے اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کو نہ صرف مشاہدے کی آنکھ سے دیکھا بلکہ انہیں اپنے فن میں سمو کر ادب کو عہد کا آئینہ بنادیا۔ یہی وہ عنصر ہے جو ادب کو محض لفظوں کا مجموعہ نہیں بلکہ زمانے کی ترجمانی کا ایک زندہ احساس بناتا ہے۔ "عصری حالات" دراصل وہ فکری و معاشرتی فضا ہیں جو کسی مخصوص دور میں رائج ہوں جن کے اثرات انسانی رویوں، اقدار، طرز معاشرت اور سوچ کے زاویوں میں نمایاں نظر آئیں۔ اردو ادب میں یہ عناصر کبھی علامتی انداز میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی براہ راست مصنف کے تجربات اور تاثرات کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ خاص طور پر خود نوشت، آپ بیتی یا یادداشت نگاری میں عصری حالات کا عکس زیادہ گہرا اور براہ راست ہوتا ہے کیونکہ وہاں مصنف اپنے عہد کے واقعات کو اپنی ذات کے تجربے کے ساتھ جوڑتا ہے، یوں فرد کی زندگی اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتی ہے۔

اردو کی آپ بیتیاں صرف ذاتی زندگی کا بیان نہیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، تہذیبی اور سماجی حالات کی تاریخ بھی ہوتی ہیں۔ ان میں مصنف کا ذاتی تجربہ زمانے کے عمومی حالات سے جڑا ہوتا ہے اس لیے قاری ان تحریروں میں نہ صرف ایک فرد کی زندگی دیکھتا ہے بلکہ پورے عہد کی اجتماعی کہانی بھی پڑھتا ہے۔ آپ

بیتیاں ایک طرح سے عہد کی دستاویز ہوتی ہیں جہاں ذاتی احساسات کے ساتھ ساتھ قوم کے دکھ سکھ، سیاسی اتار چڑھاؤ اور معاشرتی تبدیلیاں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔

"یادوں کا جشن" میں عصری اور سماجی حالات کا بیان نہایت مؤثر اور حقیقت پسندانہ انداز میں سامنے آتا ہے۔ مصنف نے اپنے عہد کے سیاسی انتشار، سماجی ناہمواری، طبقاتی تضادات اور فکری بیداری کو اپنی یادوں کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں اس دہائی کے وہ مناظر جا بجا دکھائی دیتے ہیں جب پاکستان میں جمہوریت اور آمریت کے درمیان کشمکش جاری تھی، سیاسی وفاداریاں بدلی جا رہی تھیں اور عام آدمی معاشی و اخلاقی بحرانوں میں گھرا ہوا تھا۔ مصنف نے ان حالات کو محض تاریخی واقعات کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ ان کے انسانی اور اخلاقی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔

مصنف اپنی ذاتی یادوں کے توسط سے پورے عہد کے اجتماعی دکھ کو محسوس کراتا ہے۔ اس میں وہ خود کو ایک حساس مشاہد کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جو اپنے ماحول سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ "یادوں کا جشن" میں عصری حالات صرف پس منظر نہیں بلکہ کرداروں، احساسات اور فضا کا جزو بن جاتے ہیں۔ مثلاً جب مصنف اپنے نوجوانی کے زمانے کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس عہد کے تعلیمی نظام، ثقافتی سرگرمیوں، سیاسی بے سمتی اور معاشی ناہمواریوں کا نقشہ بھی ابھر آتا ہے۔ اس طرح ذاتی زندگی اور سماجی منظر نامہ ایک وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

"یادوں کا جشن" اردو کی آپ بیتی کی روایت میں ایک ایسا نمونہ ہے جس میں فرد کی ذات اور عہد کی روح باہم گندھی ہوئی ہے۔ یہاں مصنف کا تجربہ محض ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں موجود عصری حالات ایک مکمل سماجی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے ہمیں اس دور کے سیاسی مزاج، طبقاتی تقسیم، مذہبی رجحانات اور فکری رجحانات کی جھلک ملتی ہے۔ مصنف نے اپنے عہد کے تضادات کو بیان کرتے ہوئے معاشرے کے اندر موجود روحانی خلا، اقدار کی گراوٹ اور انسان کی بے چینی کو نہایت سلیقے سے لفظوں میں ڈھالا ہے۔ اس لیے "یادوں کا جشن" محض ایک یادوں کا مجموعہ نہیں بلکہ اپنے وقت کی سماجی و فکری تاریخ کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔

یادوں کا جشن میں سماجی و عصری حالات و واقعات کی پیش کش:

جب کوئی انسان آپ بیتی لکھتا ہے تو دراصل وہ اپنی زندگی کے سفر، تجربات اور مشاہدات کو الفاظ میں محفوظ کرنے کی ایک سنجیدہ، فکری اور تخلیقی کوشش کرتا ہے۔ آپ بیتی صرف کسی فرد کی ذاتی زندگی کا بیان نہیں ہوتی بلکہ اس میں ایک پورے عہد کی روح، اس کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی حالات کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ لکھنے والا اپنی زندگی کے تمام مراحل، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک، ان تمام لمحوں کو یادوں کی روشنی میں قاری کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ فرد کی کہانی ایک دور کی اجتماعی داستان بن جاتی ہے۔ ایک سچی اور جامع آپ بیتی نہ صرف مصنف کی ذات کی آئینہ دار ہوتی ہے بلکہ اپنے عہد کے شعور، فکر اور تہذیبی مزاج کا معتبر ریکارڈ بھی ثابت ہوتی ہے۔

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی اس لحاظ سے نہایت اہم اور جامع ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو غیر معمولی سچائی، خلوص اور مشاہدے کی گہرائی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں ان کی ذات کے مختلف رنگ جھلکتے ہیں۔ ایک حساس انسان، ایک باشعور ادیب اور ایک صاحب فکر شاعر کے روپ میں۔ وہ جہاں اپنی نجی زندگی کے اتار چڑھاؤ، جذباتی کیفیات، خاندانی پس منظر اور ذاتی تجربات کا ذکر کرتے ہیں، وہیں اپنے عہد کے سماجی رویوں، تہذیبی رجحانات اور ثقافتی میلانات کو بھی غیر جانب دارانہ مگر فکری انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں زندگی کی ہمہ گیر تصویر ابھرتی ہے جو قاری کو نہ صرف ایک فرد کی داخلی دنیا تک لے جاتی ہے بلکہ اس عہد کے سیاسی و سماجی ماحول سے بھی روشناس کراتی ہے۔ بیدی کی آپ بیتی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ایک حساس اور باشعور ادیب کے نزدیک آپ بیتی ذاتی زندگی کی کہانی نہیں بلکہ عہد کے شعور کا تخلیقی اظہار ہے۔

"یہ ایک ایسی خود نوشت سوانح عمری ہے جو زندگی کے علاوہ معاشرتی اور ادبی تاریخ کی ایک اہم دستاویز بھی ہے۔" (۳)

بیدی نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو محض ذاتی حوالوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے زمانے کے سماجی، اخلاقی اور فکری حالات کا عکس بھی بڑی باریکی سے پیش کیا۔ ان کے ہاں معاشرتی تبدیلیوں کا شعور نمایاں ہے، وہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح بیسویں صدی میں اخلاقی اقدار بدلتی گئیں، معاشرتی طور طریقے نئے رخ اختیار کرتے گئے اور انسانی کردار میں بتدریج تغیر پیدا ہوا۔ اپنی جوانی کے زمانے کی اخلاقیات اور بڑھاپے کے عہد کی اخلاقی صورتِ حال کا تقابل کرتے ہوئے وہ اس تبدیلی کو نہایت فکری گہرائی سے اجاگر

کرتے ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی عناصر بھی بڑی خوبی سے گندھے ہوئے ہیں۔ بیدی صاحب نے اپنے معاشرتی ماحول کے تمام پہلوؤں کو، خواہ وہ خاندانی نظام ہو، مذہبی رواداری ہو یا ثقافتی اقدار، نہایت توازن اور غیر جانبداری کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ ایک ایسے مشاہد بن کر سامنے آتے ہیں جو اپنے زمانے کو محض بیان نہیں کرتا بلکہ اس کی تہوں میں چھپے انسانی المیوں اور سماجی سچائیوں کو بھی آشکار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آپ بیتی ایک جامع تخلیق کے طور پر سامنے آتی ہے جس میں فرد کی زندگی اور سماج کی تاریخ ایک وحدت کی صورت میں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور قاری ان کے بیانے کے ذریعے نہ صرف ایک شخص بلکہ پورے عہد کے فکری و تہذیبی شعور سے آشنا ہوتا ہے۔

تہذیب و ثقافت:

تہذیب کے لیے انگریزی میں لفظ Civilization یعنی کلچر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ لاطینی زبان کے لفظ civil سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں زراعت یا جسمانی و ذہنی اصلاح و ترقی۔ ان معنوں کو مد نظر رکھ کر ہی تہذیب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے کی با مقصد تخلیقات اور ان کی اقدار کو تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے طرز معاشرت کا نام ہے جس میں لوگوں کا رہن سہن، ان کی روایات، سیاست، ان کے مذہبی عقائد کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے داخلی و خارجی تمام پہلو شامل ہیں۔

ڈاکٹر حسن اختر ملک تہذیب کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

"ہم تہذیب کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو اسے طرز زندگی کا نام دے سکتے ہیں۔ اس طرز زندگی

میں لوگوں کا رہن سہن، سوچ، علوم و فنون، معیشت اور سیاست کے اصول، شاعری اور

موسیقی، روایات، مذہبی عقائد، زبان اور رسوم شامل ہیں۔" (۴)

تہذیب و ثقافت سے مراد انسانی طور طریقے ہیں یعنی انسان کا دوسروں کے ساتھ برتاؤ، میل جول اور اس کا طرز زندگی جو اس کے رویوں اور اعمال میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کے انفرادی اور اجتماعی نظریات جو اس کی روزمرہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ بھی تہذیب و ثقافت کے دائرے میں آتے ہیں۔ ہر قوم کی اپنی مخصوص خصوصیات، روایات، عادات اور نظریات ہوتے ہیں جو اسے دوسری اقوام سے ممتاز بناتے ہیں۔ تہذیب و ثقافت کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے جس میں انسان کے رہن سہن، لباس، خوراک، طرز گفتار، اخلاقی اقدار، فنون لطیفہ، طرز تعمیر اور زندگی کے دیگر پہلو شامل ہیں۔ یہ تمام عناصر مل کر کسی معاشرے کی

پہچان بناتے ہیں اور اسی پہچان کے ذریعے اس کی ترقی یا زوال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تہذیب و ثقافت دراصل انسانی معاشرت کی بنیاد ہے جو انسان کے باطنی اور ظاہری وجود دونوں کو سنوارتی ہے۔ جب کسی قوم کی تہذیب مضبوط اور ثقافت زندہ ہو تو وہ قوم فکری اور اخلاقی اعتبار سے مضبوطی حاصل کرتی ہے لیکن اگر یہ عناصر کمزور پڑ جائیں تو قوم کی شناخت اور اس کی سماجی وحدت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ تہذیب کے لغوی معنی دیکھے جائیں تو اس سے مراد شائستگی، تربیت، نرمی، سنجیدگی اور انسانی رویے میں اعتدال پیدا کرنا ہے جو انسان کو محض حیوانی سطح سے اٹھا کر ایک مہذب وجود میں ڈھال دیتا ہے۔

"انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے کلچر کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ کلچر لاطینی زبان کا لفظ ہے اس کے معانی ہیں زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں کی پرورش و افزائش کرنا، جسمانی و ذہنی اصلاح و ترقی۔ اردو، فارسی اور عربی میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معانی کسی درخت یا پودے کو کاٹنا، چھانٹنا، تراشنا تاکہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کو نکلیں پھوٹیں۔ فارسی میں تہذیب کے معانی آراستن پیراستن، پاک و درست کردن و اصلاح نمودن ہیں۔" (۵)

تہذیب معاشرے میں غلط چیزوں کی کانٹ چھانٹ کرتی ہے اور بہترین اخلاقیات کو پروان چڑھاتی ہے اور معاشرے میں چیزوں کی درستی کرتی ہے۔ جب کسی قوم کو دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس کی تہذیب کو کھوکھلا کرتی ہے اور اپنی تہذیب کو غالب لانے کی کوشش کرتی ہے اور اس تہذیب میں ہی زبان بھی شامل ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تہذیب و ثقافت معاشرے کا کتنا اہم جزو ہیں۔ تہذیب و ثقافت کے متعلق فیض احمد فیض لکھتے ہیں کہ

"وہ سب عقیدے، قدریں افکار، تجربے، امنگیں جنہیں کوئی انسانی برادری عزیز رکھتی ہے۔ وہ آداب، عادات، ادب، موسیقی اور طور اطوار جو اس گروہ میں رائج یا مقبول ہیں۔ ادب، موسیقی، مصوری، عمارت گری، دست کاری غرض باطنی تجربے، قدریں، عقائد و افکار اور ظاہری طور اطوار۔ پورے طریقہ زندگی کو کلچر کہتے ہیں۔ جس میں سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ کلچر کی اثر اندازی ذہنی طور پر بھی ہوتی ہے عقائد و افکار کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔" (۶)

تہذیب کسی بھی معاشرے کی انسانی تاریخ سے وابستہ ہوگی اور ثقافت انسان کے رہن سہن سے نسبت رکھتی ہے۔ طور طریقے، عادات و اطوار اور اس طرح کے دوسرے تمام عناصر ثقافت کا حصہ ہوں گے۔ تاہم تہذیب و ثقافت لازم و ملزوم ہیں اور ایک ساتھ ہی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی میں تہذیبی عناصر نہایت گہرائی اور باریکی سے جلوہ گر ہیں۔ ان کی تحریر میں جہاں ذاتی زندگی کے تجربات ملتے ہیں، وہیں مجموعی طور پر اُس عہد کی تہذیب و ثقافت کے مختلف رنگ بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ بیدی نے اپنی آپ بیتی کے ابتدائی ابواب میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جو اُس زمانے کے سماجی و تہذیبی خدوخال کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کا تذکرہ بڑے احترام اور فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔ گورونانک سے لے کر اپنے قریبی آباؤ اجداد تک کی اخلاقی اقدار، روایات اور طرزِ زندگی کو انھوں نے اپنی یادوں میں زندہ رکھا ہے۔ یہ عمل بذاتِ خود ایک تہذیبی علامت ہے کہ انسان اپنی جڑوں، روایتوں اور خاندانی ورثے سے رشتہ برقرار رکھے۔

بیدی صاحب کے نزدیک تہذیب صرف رسوم و رواج کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی کردار اور اجتماعی شعور کا عکاس بھی ہے۔ ان کی آپ بیتی کے ابتدائی حصے میں جس تہذیبی عنصر کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، وہ اس دور کے کھیلوں، میلوں اور عرسوں کی روایت ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان تقریبات کا ان کے گاؤں اور ارد گرد کے علاقوں میں کتنا گہرا اثر تھا اور لوگ ان میں کتنی دلچسپی سے شریک ہوتے تھے۔ عرس کے موقع پر صرف مذہبی رسومات ہی ادا نہیں کی جاتیں بلکہ یہ تہوار ایک ثقافتی اجتماع کی شکل اختیار کر لیتا تھا جہاں کھیل، مشاعرے، میل ملاقات اور دیگر تفریحی سرگرمیاں بھی شامل ہوتیں۔ بیدی نے نہایت محبت اور جزئیات نگاری سے ان مناظر کو قلم بند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عرس کے موقع پر پورا گاؤں ایک جشن کی صورت اختیار کر لیتا، لوگ دور دور سے آتے، عقیدت، محبت اور اشتراک کی فضا پیدا ہو جاتی۔

"اس عرس میں کشتیوں کا بہت بڑا دنگل ہوا کرتا تھا۔ یہ دنگل دو دن تک جاری رہتا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے مشہور پہلوان کشتی لڑنے آتے تھے۔" (۷)

بیدی کی آپ بیتی میں اُس دور کی ثقافتی سرگرمیوں کا نہایت جاندار اور دلکش نقشہ ملتا ہے، جس میں خاص طور پر کشتی اور شکار کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کشتی اُس زمانے کا سب سے مقبول اور پر جوش کھیل تھا۔ لوگ دُور دُور سے اس کا نظارہ کرنے آتے، پہلوانوں کے داؤ پیچ، طاقت اور فن کو دیکھ کر داد دیتے اور پورا میدان ایک تہوار کا منظر پیش کرتا۔ اگر آج کے عہد سے اس منظر کا موازنہ کیا جائے تو جیسے آج کرکٹ ایک قومی جوش و جذبے کی علامت بن چکی ہے، ویسے ہی اُس زمانے میں کشتی عوامی دل چسپی اور اجتماعی شوق کا مظہر تھی۔ جس طرح آج قوم کرکٹ کے ایک ایک لمحے پر نگاہ رکھتی ہے، اسی طرح اُس وقت لوگ کشتی کے دنگوں کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔

بیدی کے نزدیک کھیل محض تفریح نہیں بلکہ ثقافت کا مظہر ہیں۔ یہ اپنے علاقے کے مزاج، لوگوں کے ذوق اور ان کی زندگی کی حرارت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ نہ صرف ایک ذاتی یاد بیان کر رہے ہیں بلکہ اپنے پورے عہد کی تہذیبی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ایک حساس مصنف کے لیے ذاتی تجربہ کبھی محض انفرادی نہیں رہتا۔ وہ اپنے ماحول، زمانے اور سماجی فضا کا عکاس بن جاتا ہے۔ بیدی کے بیانیے میں یہی رنگ نمایاں ہے۔ ان کی یادوں میں بسنے والے مناظر اپنے عہد کی زندہ تصویریں بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں لوگوں کے مشاغل، میل جول اور تفریحی ذرائع کس نوعیت کے تھے اور کس طرح یہ سرگرمیاں ان کے معاشرتی ڈھانچے کا حصہ تھیں۔

کھیلوں کے بعد بیدی کی آپ بیتی میں دوسرا اہم ثقافتی عنصر شکار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ خود اس شوق کے نہ صرف دلدادہ تھے بلکہ اپنے خاندانی ورثے کے ایک اہم پہلو کے طور پر اسے یاد کرتے ہیں۔ ان کے ہاں شکار محض ایک مشغلہ نہیں بلکہ فن اور روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے خاندان میں شکار کی مہارت نسلاً در نسل منتقل ہوتی رہی؛ یہاں تک کہ جانوروں اور پرندوں کے شکار کے لیے مخصوص ماہرین رکھے جاتے تھے۔ بیدی نے اس تجربے کو بڑی نفاست سے بیان کیا ہے، گویا یہ شوق ان کے خاندانی وقار اور دیہی زندگی کے حسن کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔

آپ بیتی کا اقتباس کچھ یوں ہے کہ

"والد صاحب باز کے شکار کے علاوہ شیر کے شکار کے لیے بھی ہر سال جایا کرتے تھے۔ اس شکار کے لیے مارچ سے لے کر مئی کے آخر تک بہترین موسم ہوتا ہے۔ شیر کے شکار میں بھی والد صاحب کا یہ ریکارڈ ہے جو آج تک قائم ہے۔ انہوں نے ایک ہی مچان سے چھ (۶) شیر مارے۔" (۸)

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی میں شکار کو محض ایک ذاتی مشغلہ کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ یہ ایک ایسے ثقافتی عنصر کے طور پر سامنے آتا ہے جو اُس زمانے کے سماجی نظم و ضبط، بہادری اور اجتماعی تعاون کی نمائندگی کرتا ہے۔ اُس دور میں شکار کو ایک باوقار اور منظم سرگرمی سمجھا جاتا تھا۔ بیدی کے مطابق شکار کے لیے مخصوص موسم اور مہینے مقرر کیے جاتے اور اس میں حصہ لینے والے سنجیدگی اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے۔ ان کے خاندان میں شکار نہ صرف تفریح کا ذریعہ تھا بلکہ عوامی فلاح کے لیے بھی اسے استعمال کیا جاتا تھا، جیسے جب کوئی درندہ فصلوں کو نقصان پہنچاتا تو بیدی کے خاندان کے شکاری اس خطرے کو دور کرنے کے

لیے آگے بڑھتے۔ یہ تمام پہلو اس بات کا ثبوت ہیں کہ شکار اُس زمانے کی تہذیبی روایات کا ایک اہم حصہ تھا، جو نہ صرف فطرت کے ساتھ ہم آہنگی بلکہ انسانی کردار کی مضبوطی اور اجتماعی ذمہ داری کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح بیدی کی آپ بیتی میں عرس، میلوں اور ثقافتی تقریبات کا ذکر بھی نہایت اہم ہے۔ ان تقریبات کا دائرہ محض مذہبی رسومات تک محدود نہ تھا بلکہ یہ سماجی میل جول، تفریح، فنونِ لطیفہ اور عوامی اشتراک کا مظہر تھیں۔ عرس کے موقع پر رقص و موسیقی، مشاعرے، کھیل اور ڈرامے منعقد کیے جاتے جن میں ہر طبقے کے لوگ بھرپور شرکت کرتے۔ بیدی ان مواقع کو صرف عوامی تفریح نہیں سمجھتے بلکہ انہیں ایک ایسے تہذیبی توازن اور ہم آہنگی کا مظہر قرار دیتے ہیں جہاں روحانیت اور ثقافت ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ عرس اور میلوں کی یہ روایت دراصل برصغیر کی مشترکہ تہذیب کا استعارہ تھی جس نے مختلف مذاہب اور طبقوں کے افراد کو ایک ہی ثقافتی رشتے میں جوڑ رکھا تھا۔

بیدی کا کردار ان سب پہلوؤں میں ایک باشعور تہذیبی رہنما کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ محض ناظر نہیں بلکہ اپنے عہد کی تقریبات اور تحریکوں کے فعال منتظم بھی تھے۔ اپنی آپ بیتی میں وہ "نیشنل وار فرنٹ" کے قیام کا ذکر کرتے ہیں، جس کا بنیادی مقصد قومی اتحاد تھا مگر اس کے ساتھ وہ ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ ان تقریبات میں انھوں نے مقامی روایات، لباس، موسیقی اور طرزِ گفتار کو زندہ رکھنے کی شعوری کوشش کی تاکہ انگریزی اثرات کے زیرِ سایہ ان کی قومی شناخت ماند نہ پڑ جائے۔ ان کے نزدیک یہ سرگرمیاں تفریح نہیں بلکہ تہذیبی مزاحمت کی علامت تھیں۔ فسادات کے بعد دہلی میں قیام کے دوران انھوں نے لوگوں کے دلوں سے خوف کے اثرات کم کرنے کے لیے ثقافتی محافل منعقد کیں، جس سے نہ صرف ان کے انسان دوست مزاج کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان کے گہرے تہذیبی شعور اور اجتماعی احساسِ ذمہ داری کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یوں ان کی آپ بیتی ایک فرد کی سوانح سے بڑھ کر اپنے زمانے کی ثقافتی و تہذیبی تاریخ کا معتبر حوالہ بن جاتی ہے۔

اس کا ذکر مصنف کی آپ بیتی میں یوں ہے کہ "یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر لوگوں کا دل بہلتا رہے تو تخریبی کاموں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ چنانچہ میں اس سلسلے میں دو (۲) باتوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جو ہمیشہ دہلی والوں کی تفریح کا باعث ہوتی رہی ہیں۔ دہلی کی ادبی اور کلچرل تاریخ شاید ہے کہ مغلیہ دور سے ہی یہاں مشاعروں اور ادبی محفلوں سے امراء اور عوام دل بہلایا کرتے تھے۔ مرغ بازی، تیر بازی، پتنگ بازی

کا ذوق بھی عام تھا۔ چنانچہ میں نے مشاعروں کا، مرغ اور تیتڑ لڑانے کا خاص طور پر اہتمام کیا۔ مقصد دراصل یہ تھا کہ ہندو مسلم سکھ، عیسائی سبھی مذہب کے لوگ پھر سے ایک جگہ اکٹھا ہو کر تفریح کریں تاکہ فرقہ وارانہ فسادات نے جو گہرے گھاؤ لگائے تھے مندمل ہوں۔" (۹)

یہ چیزیں انسان کے لیے فطری طور پر ہی پرکشش ہیں۔ پھر ایسے معاملات کو از سر نو منعقد کروانا بھی ایک خوش آئند پہلو تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دہلی ہمیشہ سے ہی تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اسی نسبت سے بیدی نے بھی وہاں یہ کام دوبارہ شروع کیا تاکہ لوگ معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آئیں اور تہذیب کا مرکز بھی بحال ہو جائے۔ اس کے علاوہ ان کی آپ بیتی میں تہواروں کا ذکر بھی ملتا ہے ویسے تو یہ مذہبی تہوار ہیں لیکن ان میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہوتے تھے جس کی وجہ سے یہ ثقافتی پہلو بھی رکھتے ہیں۔ جیسا کہ رام لیلا کا تہوار ہندوؤں سے منسوب ہے لیکن اس میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ اس طرح بیدی کی آپ بیتی میں دیکھا گیا ہے کہ انھوں نے صرف بیان کرنے کی حد تک ان چیزوں کو نہیں رکھا بلکہ عملی اقدام بھی کیے ہیں۔ جہاں مہندر سنگھ بیدی نے اپنے دور کی تہذیب و ثقافت سے متعارف کروایا ہے وہیں پر انھوں نے بیسویں صدی کی نوجوان نسل کے حوالے سے بھی ذکر کیا ہے نئی نسل نے روایات و تہذیب کو پس پشت ڈال کر مغربی تہذیب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ بیسویں صدی میں نوجوان نسل کا حال بیان کرتے ہیں اور اقدار کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ نئی نسل نے غیر اقوام کی مثبت چیز نہیں سیکھی لیکن باقی معاملات میں بہت زیادہ مغربیت زدہ ہو گئی ہے۔ اس ضمن میں وہ والدین کے ساتھ تعلق کا ذکر کرتے ہیں۔

"ہمارے زمانے میں والدین کو یا اپنے بزرگوں کو دیکھ کر نہ صرف سسری اکال، السلام علیکم یا نمستے کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا بلکہ جھک کر پاؤں چھوئے جاتے تھے اور اب تو ہائے کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ مغربی طرز و مخاطب کو کافی سمجھنے کی کوشش کی لیکن اس "ہائے" کا مطلب ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ اکثر اوقات لڑکیوں کے درمیان اس طرح گفتگو بھی سننے میں آئی ہے: "ڈونٹ بی اسٹوپیڈ یا کم لیٹ ایٹ آئس کریم۔" اب لڑکیوں کی اس گفتگو میں لفظ یار ہماری دانست سے باہر ہے۔" (۱۰)

بیسویں صدی کی نوجوان نسل میں روایات و اقدار کا اس قدر فقدان تھا اور آج کے دور کی تہذیب مکمل مٹتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ نہ میل جول کے وہ طور طریقے ہیں نہ بات کرنے کے آداب۔ جس دور میں بیٹھ کر مہندر سنگھ بیدی نے آپ بیتی لکھی ہے آج کی نسبت اس دور میں کسی حد تک روایات کا خیال رکھا جاتا تھا لیکن ان کے معیار کے مطابق اسی وقت تہذیب کمزور پڑ چکی تھی۔ مہندر سنگھ بیدی کے مطابق انسان کو وقت

اور حالات کے ساتھ بدلتے رہنا چاہیے لیکن اپنی تہذیب کو ساتھ لے کر چلنا زیادہ اہم ہے۔ اپنی روایات کو پس پشت ڈالنا کسی بھی قوم کے لیے نقصان کا باعث ہے۔ ہر قوم سے ہر جگہ سے اچھی بات اچھا عمل سیکھنا چاہیے لیکن دوسری اقوام کا ہر ایک مثبت یا منفی پہلو خود پر طاری کرنا درست نہیں ہے۔ جب مہندر سنگھ بیدی کے احباب کی رائے کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں سے بھی یہ چیز ثابت ہوتی ہے کہ مہندر سنگھ بیدی ہندوستانی تہذیب کو کتنا اہم سمجھتے تھے۔ ان کے اکثر احباب نے ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لیے مشترکہ تہذیب کا نمائندہ، کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں پاکستان اور بھارت دونوں شامل ہیں اور اسی طرح ان کو مشترکہ تہذیب کا نمائندہ شاعر بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ عنصر ان کی آپ بیتی تک ہی نہیں محدود بلکہ ان کی عام زندگی میں بھی تہذیب کی اتنی ہی اہمیت تھی۔

شہزاد انجم ایک مضمون میں قلم فرسائی کرتے ہیں کہ

"ان کی شاعری کے افق پر مشترکہ تہذیب کے اقدار کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں، سحر صاحب گنگا جمنی تہذیب کے پرستار تھے، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے امین دہلی کی ادبی و تہذیبی زندگی کی جان۔" (۱۱)

اس کے علاوہ خواجہ حسن ثانی نظامی نے بھی ایک مضمون بیدی صاحب کے بارے میں "گنگا جمنی تہذیب کے نمائندے کنور صاحب" کے نام سے لکھا ہے کہ

"بیدی ہمارے مشترکہ کلچر اور گنگا جمنی تہذیب کے نمائندے ہیں اور مذہبی رواداری میں ان کی شخصیت مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ برصغیر کی سیاسی حد بندیوں کے باوجود ایک ایسے پسندیدہ انسان اور شہری ہیں۔" (۱۲)

تہذیبی لحاظ سے مہندر سنگھ بیدی دونوں ممالک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ انھوں نے تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں بھی کسی قسم کی جانبداری کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ انسانیت کے حساب سے ہر جگہ غیر جانبداری سے معاملات کو سلجھایا ہے اور مشترکہ تہذیب کی اہم نمائندگی کی ہے۔

مذہبی حالات و واقعات:

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی میں سماجی عناصر کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحانات اور عقائد کا تذکرہ بھی نمایاں طور پر ملتا ہے۔ سماج کی تشکیل میں مذہب بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ مذہب ہی وہ عنصر ہے جو انسان کو اخلاق، تہذیب اور اجتماعی ہم آہنگی کا شعور عطا کرتا ہے۔ جب تہذیب و اخلاق کو مذہب کے اصولوں سے

ہم آہنگ کیا جائے تو سماج کی سمت درست ہو جاتی ہے، کیونکہ مذہب انسان کو نہ صرف طرزِ زندگی سکھاتا ہے بلکہ اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کرنا بھی بتاتا ہے۔ تاریخِ عالم کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ تمام مذاہب میں اخلاقیات، احساس، انسان دوستی اور باہمی تعاون کو بنیادی تعلیمات کا درجہ حاصل رہا ہے۔ ہر مذہب جھوٹ، ظلم اور بددیانتی کو برائی قرار دیتا ہے اور سچائی، عدل اور احترامِ انسانیت کی تلقین کرتا ہے۔

اسی تناظر میں جب مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اُن کی تحریر میں مذہب نہ صرف ذاتی عقیدہ کے طور پر بلکہ ایک سماجی و اخلاقی قوت کے طور پر بھی کار فرما ہے۔ بیدی صاحب مذہب کو انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اور ان کی آپ بیتی میں ایسے متعدد مقامات آتے ہیں جہاں مذہب کو فرد اور معاشرے کے درمیان رشتہ استوار کرنے والے عنصر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

مہندر سنگھ بیدی خود سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے، مگر اُن کا رویہ ہمیشہ وسعتِ نظری اور رواداری پر مبنی تھا۔ وہ ہر مذہب کے ماننے والے کے لیے یکساں احترام کے قائل تھے اور انسانیت کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ ان کی آپ بیتی میں اس رجحان کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے بابا گورو نانک کا ذکر نہایت عقیدت اور فخر سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ بابا گورو نانک کی سترہویں پشت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بیدی نے نہ صرف گورو نانک کے عقائد کا ذکر کیا بلکہ اُن کی تعلیمات کو اپنی زندگی کے اصول کے طور پر اپنایا۔ گورو نانک کی تعلیمات سچائی، محبت، انسانی مساوات اور خدمتِ خلق بیدی کی شخصیت میں جھلکتی ہیں۔

"آپ صلح کل کے شیدائی، وحدانیت کے پرستار۔ امن و آشتی و اخوت کے علم بردار تھے۔ مذہبی رواداری آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ ہر مذہب کے لوگوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہندو آپ کو ہندو، سکھ آپ کو سکھ اور مسلمان آپ کو مسلمان تصور کرتے تھے۔" (۱۳)

مذہب چاہے کوئی بھی ہو، اس کے حقیقی مبلغین نے ہمیشہ انسانیت، محبت، رواداری اور اخلاق کا درس دیا ہے۔ بابا گورو نانک سکھ مذہب کے اولین علمبرداروں میں سے ہیں جنھوں نے انسان کو انسان سے جوڑنے کا پیغام دیا۔ مہندر سنگھ بیدی اپنی آپ بیتی "یادوں کا جشن" میں اپنے عقائد کو "میرے عقائد" کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔ وہ ذاتی طور پر سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور اس کی بنیادی

تعلیمات کے پیروکار تھے، مگر ان کے ہاں مذہبی تعصب نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب انسان کو انسانیت سے قریب کرتا ہے، جدا نہیں کرتا۔ اسی نظریے کے تحت انھوں نے "نزولِ پیغمبر" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ خدا نے ہر دور میں اپنی مخلوق کی راہنمائی کے لیے نیک بندے دنیا میں بھیجے، تاکہ وہ لوگوں کو سیدھی راہ دکھائیں اور نیکی، محبت و امن کا پیغام عام کریں۔ اس نظم کے ذریعے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تمام مذاہب کا مقصد انسان کو بہتر بنانا اور اسے ایک دوسرے کا مددگار بننے کی تلقین کرنا ہے۔ ان کے نزدیک تمام انبیاء، اوتار اور نیک لوگ ایک ہی پیغام کے علمبردار تھے۔

مہندر سنگھ بیدی نے نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ عملی زندگی میں بھی مذہبی رواداری کو اپنایا۔ ان کے بزرگوں کی طرح ان کے اندر بھی رواداری، محبت اور خدمتِ خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ہر مذہب اور اس کے ماننے والوں کا احترام کرتے تھے۔ تقسیمِ ہند کے دوران جب فسادات اپنے عروج پر تھے، تب بیدی نے انسانیت کا علم بلند رکھا۔ انھوں نے مذہب کی بنیاد پر کسی امتیاز کے بغیر خدمتِ خلق کو شعار بنایا۔ رفیوجیوں کی مدد کی، بے گھر افراد کے لیے انتظامات کیے اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ان کے مکانات خالی کروائے تاکہ وہ محفوظ رہ سکیں۔ ان کی زندگی کی یہ مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مذہبی رواداری ان کے کردار کا لازمی جزو تھی۔

"میں نے گوردواروں میں تقریریں کی ہیں۔ سیرت النبی کے جلسوں میں خلوص دل سے شرکت کی ہے۔ گرجاؤں اور مندروں میں بھی مختلف تہواروں پر اظہارِ عقیدت کیا ہے مگر یہ دکھاوانہ تھا۔ میں صدق دل سے تمام پیغمبروں، اوتاروں، ولیوں اور سنتوں کو مانتا ہوں۔ لیکن چونکہ میری پرورش ایک ایسے علاقہ میں ہوئی جہاں مسلم اکثریت تھی اور پھر مجھے ملازمت کے دوران بھی ایسے مقامات پر رہنا پڑا جہاں مسلم قوم سے زیادہ واسطہ پڑا، اس لیے میں دوسرے مذاہب کی نسبت اسلام سے زیادہ قریب ہوں۔" (۱۴)

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی شخصیت کی مقبولیت اور وقعت کی ایک بڑی وجہ ان کا ہر طرح کے تعصب سے گریز اور انسانی ہمدردی پر مبنی طرزِ فکر تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی نیک اور علم و فن میں بلند کیوں نہ ہو، مذہب کے معاملے میں کسی نہ کسی درجے پر تعصب کا شکار ہو جاتا ہے، مگر بیدی کے ہاں یہ کیفیت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ان کے نزدیک مذہب کا مقصد انسانوں کو جوڑنا تھا، توڑنا نہیں۔ وہ مذہب کو انسانیت کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے تھے، اسی لیے ان

کی فکر میں انسانیت کو مقدم اور مذہب کو اس کا معاون قرار دیا گیا ہے۔ ان کا یقین تھا کہ جب انسان مذہبی تفریق سے بلند ہو کر سوچتا ہے تو وہ اصل انسانی اقدار کو چھو لیتا ہے۔ وہ بارہا اس امر کی تلقین کرتے ہیں کہ مذہب کی تعلیمات پر خلوص نیت سے عمل کیا جائے، مگر اسے تعصب اور نفرت کا آلہ نہ بنایا جائے۔ ان کی تحریروں میں یہی جذبہ جھلکتا ہے کہ اگر انسان مذہبی وابستگی کے ساتھ خدمتِ خلق اور محبت کو شعار بنائے تو اس کا کردار محدود ذات سے نکل کر عالمگیر انسانیت کا مظہر بن جاتا ہے۔

مہندر سنگھ بیدی کی مذہبی رواداری کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے سکھ، ہندو اور مسلمان تینوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اپنی آپ بیتی "یادوں کا جشن" میں انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار کا ذکر کرتے ہوئے مذہب کے حوالے سے بہت کم بات کی، اور جب کی بھی تو بڑی سنجیدگی، درد مندی اور وسعتِ نظر کے ساتھ۔ ان کا مضمون "میرا خدا" اس بات کا مظہر ہے کہ وہ خدا کے متعلق نہایت حساس، وحدت پرست اور غیر متعصب تھے۔ ان کے نزدیک خدا ایک ہی ہے جو سب کا ہے، اور انسان کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ مذہب کی روح یعنی نیکی، عدل، اور محبت کو اپنی زندگی میں مجسم کرے۔ بیدی نے متحدہ ہندوستان کا وہ زمانہ بھی دیکھا جب مختلف مذاہب کے لوگ باہم شیر و شکر تھے، اور تقسیم ہند کے بعد وہ بھیانک دور بھی دیکھا جب مذہب انسانوں کے درمیان دیوار بن گیا۔ لیکن ان حالات کے باوجود انھوں نے ہمیشہ امن، رواداری اور انسانی یگانگت کا پیغام دیا۔ فسادات کے دوران انھوں نے خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنایا اور ہر مذہب کے محتاج انسان کی مدد کی۔ ان کے رویے اور افکار سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بیدی نے مذہب کو انسانیت کے تناظر میں سمجھا، اس پر عمل کیا، اور عملی زندگی میں مذہبی ہم آہنگی کا زندہ نمونہ پیش کیا۔

اخلاقی اقدار:

جب کسی معاشرے کی تشکیل کی بات کی جاتی ہے تو اس کے بنیادی عناصر میں اخلاقی اقدار کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ یہی اقدار انسان کے رویوں، تعلقات اور طرزِ زندگی کو متعین کرتی ہیں۔ اخلاقی اقدار سے مراد محض گفتار کی نرمی یا معاملات میں شرافت نہیں بلکہ یہ ایک جامع تصور ہے جس میں دوسروں کے ساتھ حسن سلوک، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، صبر، برداشت، عفو و درگزر اور خدمتِ خلق جیسے پہلو شامل ہیں۔ یہ اقدار نہ صرف فرد کے کردار کو نکھارتی ہیں بلکہ پورے معاشرتی ڈھانچے کو

استحکام بخشی ہیں۔ جب انسان اپنے ارد گرد کے لوگوں کی ضروریات، احساسات اور حقوق کا خیال رکھتا ہے تو یہی جذبہ معاشرتی ہم آہنگی اور انسانی اخوت کا سبب بنتا ہے۔

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی میں یہی پہلو نمایاں طور پر ملتا ہے کہ ان کی زندگی اخلاقی اقدار کی مضبوط بنیادوں پر استوار تھی۔ ان کے خاندان کی تربیت اور ماحول میں اخلاقیات کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ وہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن دولت و مرتبے کے باوجود ان میں غرور یا تکبر کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے برعکس ان کے خاندان کے افراد غریبوں کی مدد، ضرورت مندوں کا سہارا بننے اور دوسروں کی ضروریات کا خیال رکھنے کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ بیدی اپنی آپ بیتی میں اس کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کے بزرگ کھانے کے وقت ہر مذہب کے لوگوں کو مدعو کرتے تھے اور کھانے میں اس امر کا خاص خیال رکھتے تھے کہ کوئی ایسی چیز شامل نہ ہو جو کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کے لیے نامناسب سمجھی جائے۔ یہ طرزِ عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے ہاں اخلاقی اقدار صرف نظری نہیں بلکہ عملی صورت میں موجود تھیں۔ انسان دوستی، احترام آدمیت اور مذہبی رواداری ان کے اخلاقی فلسفے کا حصہ تھیں۔

اخلاقی اقدار کا دوسرا اہم پہلو جس پر بیدی نے خاص زور دیا، وہ احترام و حفظ مراتب کا جذبہ ہے۔ ان کے نزدیک بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے محبت محض اخلاقی رویہ نہیں بلکہ انسانیت کا تقاضا ہے۔ وہ خود بھی اپنے بڑوں کے نہایت ادب و احترام سے پیش آتے تھے اور اس رویے کی تلقین دوسروں کو بھی کرتے تھے۔ ان کی آپ بیتی میں جا بجا ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں وہ اپنے اساتذہ، بزرگوں اور رہنماؤں کے لیے عقیدت کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ جس معاشرے میں احترام بزرگ، شفقتِ صغیر، اور باہمی ادب کا چلن باقی رہے، وہاں کبھی اخلاقی زوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار میں نرمی، بردباری اور متانت نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ خود کو دوسروں سے برتر نہیں سمجھتے تھے بلکہ ہمیشہ خلوص، انکساری اور خدمت کے جذبے کے ساتھ پیش آتے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو اس بات کی علامت ہے کہ حقیقی اخلاقیات وہی ہیں جو قول سے زیادہ عمل میں ظاہر ہوں۔ چنانچہ مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی صرف ذاتی تجربات کا بیان نہیں بلکہ ایک ایسے انسان کا آئینہ ہے جو اخلاقی اقدار، انسانی ہمدردی اور احترامِ انسانیت کے اصولوں پر مکمل طور پر کاربند رہا۔

"میں نے ہمیشہ بڑوں کا احترام کیا ہے اور چھوٹوں سے احترام کی توقع رکھی ہے۔ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ بیٹا باپ سے گستاخی یا لاپرواہی سے پیش آئے یا چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی عزت اور فرمانبرداری نہ کرے۔ بچپن ہی سے میں نے اس پر عمل کیا ہے اس لیے کہ میں

نے اپنے بزرگوں کو ان کے بزرگوں سے ایسا ہی سلوک کرتے دیکھا ہے۔ جب بھی کبھی کسی کو اپنے سے بڑوں سے گستاخانہ برتاؤ کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے۔" (۱۵)

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی کے مطالعے سے یہ پہلو نمایاں طور پر سامنے آتا ہے کہ انھوں نے محض اخلاقی اقدار کی تلقین نہیں کی بلکہ خود اپنی زندگی میں ان پر عمل بھی کیا۔ وہ احترام و حفظ مراتب کے قائل تھے اور دوسروں کو اسی طرزِ عمل کی نصیحت کرتے تھے۔ ان کے نزدیک عزت و احترام کا جذبہ صرف ایک سماجی فریضہ نہیں بلکہ انسان کے باطن کی تہذیب کا مظہر ہے۔ بیدی صاحب کے ہاں احترام کی روایت محض رسمی یا سطحی نہیں بلکہ وراثتی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے بڑوں سے جو دیکھا، وہی اپنی زندگی میں اپنایا۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اخلاقیات نہ صرف تربیت کا نتیجہ ہیں بلکہ ورثے میں منتقل ہونے والی اقدار بھی ہیں۔ تاہم، ان کا موقف یہ ہے کہ انسان کے لیے یہ انتخاب ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ وہ اس ورثے کو کس رخ پر لے جائے۔ مثبت یا منفی۔ بیدی نے اس وراثت کے مثبت پہلو کو اختیار کیا اور اسے اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار میں ایک توازن، نرمی اور وقار جھلکتا ہے۔ ان کے نزدیک گھر کی تربیت ہی معاشرتی رویوں کی بنیاد ہے، اور جو فرد اپنے گھر میں حفظ مراتب سیکھ لیتا ہے، وہ معاشرے میں بھی دوسروں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح ان کی اخلاقیات کا دائرہ صرف ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی سطح تک پھیل جاتا ہے، جو ایک مہذب سماج کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

مہندر سنگھ بیدی کے نزدیک اخلاقیات کا اعلیٰ ترین درجہ خدمتِ خلق ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کی اصل روح دوسروں کے کام آنے، ان کی تکالیف دور کرنے اور ان کے دکھ درد کو محسوس کرنے میں پوشیدہ ہے۔ بیدی نے اپنی زندگی میں اس تصور کو عملی جامہ پہنایا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے مذہب یا طبقے تک خود کو محدود رکھا بلکہ ہر انسان کے ساتھ بلا تفریق مذہب و ملت بھلائی کا سلوک کیا۔ فسادات کے ہنگام میں ان کا کردار اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ انسان کو مذہبی شناخت سے بالاتر دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک انسان کی خدمت ہی عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ یہی سوچ ان کے پورے اخلاقی نظام کی بنیاد تھی کہ اگر فرد اپنے رویوں میں خلوص، احترام اور خدمت کو شامل کر لے تو پورا معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ بیدی کی اخلاقیات صرف نصیحت نہیں بلکہ عملی تجربہ ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ انسانیت کی بقا اسی وقت ممکن ہے جب انسان خود کو دوسرے کے دکھ کا شریک سمجھے اور اپنی ذات سے باہر نکل کر اجتماعی بھلائی کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی آپ بیتی دراصل اسی اخلاقی فلسفے کی زندہ تفسیر ہے جس میں احترام، رواداری

اور خدمتِ خلق ایک مکمل انسانی ضابطہ حیات کی صورت میں جلوہ گر ہیں۔ "خدمتِ خلق کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے اور بزرگوں کا یہ قول کہ "ہر کہ خدمتِ کرد او مخدوم شد" سو فیصدی صحیح ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں، اوتاروں، سنتوں اور مہاتماؤں نے بھی اس اصول پر عمل کیا ہے اور مخدوم ہوئے ہیں۔ میں کوئی پیغمبر نہ ولی، سنت نہ مہاتما ہوں مگر یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ بہت ہی کم آدمیوں کو یہ توفیق عطا فرماتا ہے کہ وہ خلقِ خدا کی خدمت کر سکیں۔ یہ توفیق نعمتِ خداوندی ہے اور اس سے گریز کرنا ہر لحاظ سے کفرانِ نعمت ہو گا۔" (۱۶)

اخلاقیات کے دائرے میں خدمتِ خلق کو مرکزی اور اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے، کیونکہ یہی وہ قدر ہے جو انسانیت کی اصل روح کو اجاگر کرتی ہے۔ مہندر سنگھ بیدی کے نزدیک دوسروں کی مدد کرنا محض ایک سماجی فریضہ نہیں بلکہ ایک روحانی عمل ہے۔ ایک ایسی عبادت جس سے انسان اپنے خالق کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ وہ اس نظریے کے قائل تھے کہ جب انسان کسی دوسرے کی بھلائی کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی زندگی میں خیر و برکت کے دروازے کھولتا ہے۔ بیدی کا ایمان تھا کہ زندگی باہمی تعاون سے ہی چلتی ہے، کوئی بھی فرد تنہا اپنی بقا برقرار نہیں رکھ سکتا۔ لہذا، خدمتِ خلق انسان کے اخلاقی اور روحانی توازن کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کی تحریروں میں یہ پیغام واضح طور پر جھلکتا ہے کہ دوسروں کے دکھ کو محسوس کرنا اور ان کے لیے سہارا بننا ہی انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ ان کے نزدیک خدمت کے عمل میں مذہب، طبقے یا قوم کی کوئی قید نہیں، بلکہ ہر نیک نیتی سے کی گئی بھلائی خود انسان کے وجود کو سنوار دیتی ہے۔

"رشوت صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے قریب قریب سارے ہی ملکوں میں رائج ہے۔ بلکہ مغربی ممالک میں تو رشوت ایک فنِ سائنس بن گئی ہے اور رشوت لینے والوں کے باقاعدہ منظم گروہ بنے ہوئے ہیں جو مختلف تاجروں کی تجارت کو فروغ دینے اور ان کی جان کی حفاظت کرنے کے لیے کروڑوں روپیہ سالانہ ان سے وصول کرتے ہیں اور اگر کوئی اس میں مداخلت کرے تو قتل تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔" (۱۷)

جہاں بیدی نے خدمتِ خلق کو عبادت کا درجہ دیا وہیں انھوں نے اخلاقی برائیوں کے خلاف بھی بھرپور آواز بلند کی۔ ان کے نزدیک اخلاقیات کا مفہوم صرف نیکی کرنا نہیں بلکہ برائی کے خلاف ڈٹ جانا بھی ہے۔ اس تناظر میں بیدی نے اپنی آپ بیتی میں رشوت کو نہ صرف ایک سنگین سماجی جرم قرار دیا بلکہ اسے کبیرہ گناہ کے مترادف سمجھا۔ ان کے مطابق رشوت وہ ناسور ہے جو فرد کی نیت کو زنگ آلود اور معاشرے کے انصاف کے نظام کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ رشوت کی بنیاد پر جب حق دار محروم اور نااہل کو نوازا جاتا ہے تو یہ

صرف ایک شخص کی بد عنوانی نہیں بلکہ پورے سماجی ڈھانچے کی شکست ہے۔ یہ جرم صرف لینے والے کا نہیں بلکہ دینے والے کا بھی ہے اور یہی باہمی گٹھ جوڑ معاشرے کو زوال کی طرف دھکیلتا ہے۔ وہ رشوت کے مسئلے کو صرف ملکی سطح تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے بین الاقوامی بد عنوانی کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ ایک ایسی لعنت جو انسانی ضمیر اور عدل دونوں کو مسخ کر دیتی ہے۔ بیدی کا یہ موقف دراصل اس بات کی علامت ہے کہ وہ اخلاقیات کو محض ذاتی سطح پر نہیں بلکہ اجتماعی فلاح کے پیمانے پر پرکھتے ہیں اور ان کے نزدیک ایک صالح معاشرہ وہی ہے جہاں خدمتِ خلق کو عبادت اور بد عنوانی کو سب سے بڑا گناہ سمجھا جائے۔

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ محض اخلاقی اصولوں کے قائل ہی نہیں بلکہ ان پر عمل پیرا بھی تھے۔ ان کی زندگی میں قول و فعل کا تضاد نہیں ملتا۔ ملازمت کے دوران دیانت، فرض شناسی اور انصاف پسندی ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ وہ صرف اخلاقیات کی تلقین نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی ان اصولوں کو برت کر دکھاتے تھے۔ رشوت، جھوٹ، بددیانتی اور نا انصافی جیسے جرائم کے سخت مخالف تھے اور معاشرتی سطح پر ان کے سدباب کے خواہاں بھی۔ ان کی تحریروں سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ بیدی کے نزدیک اخلاق محض مذہبی یا سماجی فریضہ نہیں بلکہ انسانی بقا اور تہذیبی استحکام کی بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آپ بیتی نہ صرف ایک فرد کی سوانح ہے بلکہ اخلاقی کردار کی روشن مثال بھی۔

معاشی حالات و واقعات:

کسی بھی معاشرے میں افراد کے معاشی حالات کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ انسان کے کاروبار، ملازمتیں اور جو بھی وہ کام اپنی معاش کے لیے کر رہے ہوتے ہیں وہ ان کا ذاتی طور پر ایک معاشی نظام ہوتا ہے۔ مہندر سنگھ بیدی کی خود نوشت میں معاشی حالات و واقعات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی آپ بیتی میں زمینداری کا تصور بہت زیادہ اہم ہے۔ اس وقت کے زیادہ تر امیر گھرانوں کا ذریعہ معاش یہی تھا۔ بیدی خود بھی ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جو خاندان زمیندار تھے ان کو معاشی طور پر مستحکم سمجھا جاتا تھا۔ مہندر سنگھ بیدی بھی ایسے ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مہندر سنگھ بیدی کا خاندان مالی اور اخلاقی لحاظ سے کس قدر سارے علاقے پر غالب تھا۔ اس سلسلے میں جب ان کی زندگی پر غور کیا جائے تو یہ زمینداری ان کی تقسیم سے پہلے کی تھی جب وہ منگمری میں تھے۔ جب ان کو اور ان کے خاندان کو اپنا علاقہ چھوڑ کر ہجرت کر کے بھارت جانا پڑا تو وہاں کے حالات ان کے لیے مختلف تھے۔ ان کے

ذریعہ معاش میں اپنی ملازمت تھی جس میں ان کا مختلف علاقوں میں تبادلہ ہوتا رہا جیسے دہلی، گواڑ گاؤں، جالندھر، ریتک وغیرہ۔ معاشی حالات و واقعات کے ضمن میں انھوں نے آپ بیتی میں صنعت کاروں کے متعلق بھی بات کی ہے۔ "صنعت کاروں کے پاس لاکھوں کروڑوں کا لادھن ہے جو ہندوستان میں اور باہر کے ملکوں میں چھپا رکھا ہے۔ ان کا "کاروبار" باقاعدہ چل رہا ہے۔ زمیندار کی آمدنی محدود کر دی گئی ہے لیکن صنعت کار اس سے مبرا ہے۔ اگر واقعی امیری اور غربی کا امتیاز مٹانا مقصود تھا تو برلاٹا، ڈالیا، سنگھانیا وغیرہ کی تمام آمدنی سرکار غریبوں کے لیے لیتی اور ان کی مناسب تنخواہیں مقرر کر دیتی تاکہ یہ لوگ اس سے زیادہ نہ لے سکیں اور باقی روپیہ غریبوں کی امداد میں خرچ کیا جاسکے۔ لیکن ایسا ہوتا بھی کیسے اور کیوں؟ لوگ سبھا اور ودھان سبھاؤں کے چناؤں میں کھربوں روپیہ جو خرچ ہوتا ہے وہ کہاں سے آتا۔ حکومت کانگریس کی ہو یا جنتا پارٹی کی یا اور کوئی سیاسی پارٹی حکومت کرے چناؤ سب کو لڑنا ہے۔ ایسے وقتوں میں صنعت کاروں کے علاوہ کون کھربوں روپیہ چندہ دے سکتا ہے۔" (۱۸)

حکام بالا از خود صنعت کاروں کو ہر جگہ ڈھیل دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں غریب مزید غریب ہوتا چلا جاتا ہے اور امیر مزید امیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ تمام صورت حال حکومت کے پیش نظر ہوتی ہے لیکن ہر سیاسی جماعت اپنے مفاد کی خاطر صنعت کار کو محدود نہیں کرتی جس کی وجہ سے معاشی نظام بہتر ہونے کے بجائے مزید خراب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کی نظر میں زمینداری اور جاگیر داری کا نظام اس سے بہتر تھا کہ زمیندار اور جاگیر دار طبقے کی اصلاح کی جاتی مگر یہ نظام نہ ختم کیا جاتا۔

یادوں کی برات میں سماجی و عصری حالات و واقعات کی پیش کش:

یادوں کی برات جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی ہے۔ جب اس کتاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی آپ بیتی میں انھوں نے سماجی لحاظ سے اپنے دور کے اور ایام طفلی کے تجربے سے اس زمانے کے اوہام اور سماجی اقدار کو بیان کیا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" محض ایک شخصی سوانح نہیں بلکہ اپنے عہد کی مکمل جھلک پیش کرنے والی تصنیف ہے۔ جوش نے اس کتاب میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ جن شخصیات سے ملے، جن تحریکوں میں شریک ہوئے اور جن نظریاتی مباحث کا حصہ بنے، ان سب کا احوال نہایت بے باکی سے بیان کیا ہے۔ اسی لیے "یادوں کی برات" صرف ان کی ذاتی یادداشتوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ برصغیر کے اس عہد کی ایک زندہ اور حقیقی تصویر پیش کرتی ہے جس میں آزادی کی جدوجہد، سیاسی انتشار،

ادبی تحریکیں اور فکری مباحث اپنے عروج پر تھے۔ اس لحاظ سے یہ تصنیف ایک ایسی تاریخی و سماجی دستاویز بن جاتی ہے جس سے اس دور کے فکری و تہذیبی میلانات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آپ بیتی میں سیاسی و سماجی واقعات کے بیان کے متعلق انوار احمد خاں لکھتے ہیں:

"جوش نے "یادوں کی برات" میں اپنی زندگی کے ساتھ اپنے عہد کو بھی پیش کیا ہے۔ اس میں اہم ادبی، سیاسی، عصری اور حکمران شخصیات کا تذکرہ شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ تصنیف ایک سماجی اور سیاسی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔" (۱۹)

جوش ملیح آبادی کی تحریروں، خصوصاً "یادوں کی برات" کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے ہاں سماجی اور تہذیبی شعور نہایت گہرائی کے ساتھ موجود ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں صرف ذاتی تجربات یا مشاہدات تک محدود نہیں رہتے بلکہ اپنے عہد کی تہذیب، ثقافت اور مذہبی رجحانات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کی تحریر سے قاری کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کے نزدیک مذہب محض عقیدے کا نہیں بلکہ فکری آزادی اور انسانی شرافت کا مظہر ہے۔ ان کا زاویہ نظر اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ معاشرتی اقدار کو تقلید کی بجائے عقلی و فکری بنیادوں پر پرکھتے ہیں۔ اپنی فطری سرکشی اور آزاد طبعی کے باعث جوش نے اپنے عہد کے روایتی سماجی رویوں اور مذہبی جمود کو رد کیا اور ایک ایسی ڈگر اختیار کی جو ان کی فکری انفرادیت کا ثبوت بن گئی۔

ان کی آپ بیتی میں انسان اور معاشرے کے باہمی تعلق کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ آپ بیتی میں مرکزی کردار مصنف خود ہوتا ہے، اس لیے جوش کے تجربات اور تاثرات دراصل اس معاشرے کے فکری اور تہذیبی منظر نامے کی عکاسی کرتے ہیں جس میں وہ زندہ رہے۔ ان کے مشاہدات سے قاری پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ جوش نہ صرف اپنے دور کے رائج تصورات سے اختلاف رکھتے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر سماجی اصولوں اور مذہبی تعبیرات کو چیلنج کرتے ہیں۔ یوں "یادوں کی برات" محض ذاتی واقعات کا بیان نہیں بلکہ ایک انسان خود آگاہ کے فکری سفر کی داستان ہے، جو اپنے معاشرے سے مکالمہ کرتے ہوئے اسے آئینہ دکھاتا ہے۔

تہذیب و ثقافت:

جب "یادوں کی برات" میں جوش ملیح آبادی کی تہذیبی جھلکیاں دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی آپ بیتی محض یادوں کا سلسلہ نہیں بلکہ برصغیر کی تہذیبی تاریخ کا آئینہ ہے۔ جوش نے اپنے عہد کی مختلف تہذیبوں کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کہیں ہمیں ملیح آبادی کی مقامی تہذیب اپنی تمام سادگی، خلوص اور دیہاتی کشش کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے، تو کہیں پٹھانوں کی جفاکش، غیرت مند اور بہادرانہ روایات نمایاں ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف لکھنؤ کی نفاست، شائستگی اور تہذیبی نزاکتیں بھی ان کے بیان میں اپنی پوری دلکشی کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ گویا جوش کی آپ بیتی میں تہذیب کا تصور ایک خطے یا خاندان تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک کثیرالجہتی ثقافتی نقشہ پیش کرتی ہے جس میں پورے ہندوستان کی روح سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔

جوش نے نہ صرف مشرقی تہذیب کی رنگارنگی کو خلوص سے بیان کیا ہے بلکہ انگریزی تہذیب کی مصنوعی چمک دمک اور اخلاقی زوال پر طنز کے تیر بھی برسائے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندانی پس منظر کو اس تہذیبی تسلسل کی بنیاد قرار دیا ہے جہاں آباؤ اجداد کے قصے، رسوم و رواج، خاندانی روایات اور ملیح آباد کے معاشرتی رنگ ایک مکمل ثقافتی فضا تخلیق کرتے ہیں۔ جوش اپنے خاندان کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ وہ کہاں سے آکر ملیح آباد میں آباد ہوئے اور کس طرح ان کے خون میں مشرقی اقدار، غیرت، اور زبان و بیان کی شائستگی گھل مل گئی۔ یوں "یادوں کی برات" صرف ذاتی تاریخ نہیں بلکہ ایک تہذیبی ورثے کا بیان ہے جو وقت کے دھارے پر اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

"یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے، جس کے ایک گوشے میں ہم لوگ یعنی درہ خیبر سے آئے ہوئے آفریدی اور دوسرے گوشے میں گندھار سے آئے ہوئے قندھاری آباد ہیں۔ ہندوستان میں آکر بھی اور جوار لکھنؤ میں رہنے کے باوجود ہم نے اپنی جنگ جوئی کی عادت نہیں چھوڑی اور آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین ایک مدت دراز تک تلوار چلتی آرہی ہے۔" (۲۰)

جوش ملیح آبادی پٹھان تھے۔ اس کے علاوہ یہ کہ جوش ملیح آبادی کے آباؤ اجداد درہ خیبر سے ہندوستان آکر آباد ہوئے تھے۔ ایک تو ان کی پٹھان ہونے کے ناطے اپنی تہذیب تھی اور جب وہ یہاں آکر آباد ہوئے تو ان کی تہذیبی زندگی میں لکھنؤی اور پٹھانی تہذیب کا امتزاج شامل ہو گیا۔ اس لحاظ سے وہ یہ بھی

بیان کرتے ہیں کہ اس علاقے میں بسنے کے بعد ان کا مکمل طور پر رہن سہن اٹھنا بیٹھنا لکھنؤ کی تہذیب جیسا ہو چکا تھا۔ لباس اور آداب کے متعلق بات کرتے ہیں کہ

"لکھنؤ کی واپسی ٹوپیاں ملل اور ریشم کے کڑھے ہوئے شربتی انگرکھے، سلمی ستاری کی رضائیاں
مخمل کے لحاف جوک کا عطر قنوج کا تیل پھلیل اور عشروئے کے پاجامے۔" (۲۱)

ان کی تہذیب لباس اور کھانے پینے کے لحاظ سے یکسر بدل گئی اور مکمل طور پر لکھنؤی تہذیب میں ڈھل گئی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماحول اور تہذیب کا کس قدر اثر ہوتا ہے کہ انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا اور وہ اگر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں لمبے عرصے کے لیے منتقل ہونے آتا ہے تو اس کا رہن سہن مکمل طور پر بدل جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ دیکھنے والوں کو لگتا ہے کہ یہ اسی علاقے کا باسی ہے۔ اس کے علاوہ جوش ملیح آبادی نے آداب کا ذکر کیا ہے۔

"السلام علیکم کے بجائے آداب تسلیمات کو ریش اور بندگی اختیار کیا۔ اس کے ساتھ بیت بازیا
اور مشاعرے بھی ہونے لگے اور صحت زبان کے تصور نے بھی آنکھیں کھول دیں۔" (۲۲)

غرض یہ کہ ہر طرح کے رہنے سہنے کے اطوار بدل چکے تھے وہ پٹھان جو درہ خیبر سے آئے تھے۔ وہ خالص لکھنؤی لگنے لگے اتنا ہی نہیں بلکہ وہاں کی تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ بھی لینا شروع کیا اور پھر آگے چل کر پتہ چلتا ہے کہ ان کے خاندان میں ان کے پر دادا، دادا اور والد صاحب یہ تمام لوگ شاعر تھے۔ دوسری طرف یہ کہ ان کے اجداد کی عادات میں کوئی فرق نہ آیا۔ یعنی لڑائیاں، انتقام، جنگیں یہ سب ان کی عادات میں جوں کا توں رہا۔ یعنی جوش ملیح آبادی اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ظاہری طور پر تو تہذیب بدل گئی۔ مہذب بن گئے، ادب آداب میں لحاظ آگیا لیکن عادات و اطوار کوئی تبدیلی نہیں آسکی۔ مدتوں کے جھگڑے نہ ختم ہو سکے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کہیں بھی جائے مگر عادات و فطرت بدلنا انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ عادات و اطوار انسان کے تہذیب کے ذریعے نہیں بدلتے۔ چاہے وہ معاملات ذاتی طور پر ہوں یا قبائل کی حد تک ہوں فطرت کی تبدیلی کا تہذیبی تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لحاظ سے وہاں کے امیرانہ مزاج اور امیرانہ طور طریقے ہونا اور لکھنؤی تہذیب میں گھروں میں مشاعرے ہونا ایک عام بات تھی کیونکہ ان کا اصل سرمایہ اور پہچان ہی زبان تھی۔ اسی لحاظ سے مشاعرے اس تہذیب کا خاص عنصر تھے۔ زبان و ادب کی اتنی اہمیت تھی کہ تفریح کے لیے مشاعروں کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جوش ملیح آبادی نے کچھ اپنے دور کا تہذیبی پہلو "میرے زمانے کے اوہام" کے نام سے بیان کیا ہے۔ اس میں یہ بتاتے ہیں کہ کیسے کیسے اوہام اور عقائد تھے

لوگوں کے۔ جوش ملیح آبادی ان تمام رسوم و رواج میں رہنے کے باوجود ان چیزوں کو فقط تفریح سمجھتے تھے اور ہمیشہ ان چیزوں کے انکاری رہے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں: "میرے خاندان کی خواتین پر خوف ناک تصورات منڈلایا کرتے تھے۔ یوں تو ہر محل میں ارواح خبیثہ کی عمل داری تھی۔ لیکن وہ محل جس میں دادا میاں رہتے تھے جس کا نام تھا بڑا محل وہ تو خصوصیت کے ساتھ۔۔۔۔۔ دنیا بھر کے شہید مردوں ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء کے تمام مقتول گوروں۔۔۔ بھوتوں پریتوں پلیدوں دیوؤں چڑیلوں بھتیوں پچھلی پائیوں بڑسروں اور جنوں کی راج دھانی سمجھا جاتا تھا۔۔۔ ار تمام خواتین کو اس امر کا یقین تھا کہ آدھی رات کے اندھیرے میں اس محل کے تمام گوشوں کو نوں کھتروں کو ٹھریوں، مچانوں، طاقوں، سہ دریوں، زمینوں، کلیوں، نالیوں اور ناغولوں سے نکل نکل کر خبیث روہیں دھاچو کڑی کیا کرتی ہیں۔" (۲۳)

اوہام یوں تو انسان کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جب یہ ایک معاشرے میں یہ ہر جگہ عام ہو جائیں تو آہستہ آہستہ تہذیب کا حصہ بن جاتے ہیں اور عقائد کی صورت اختیار کر دیتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے اس عنصر کو طنز اور مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے جس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جوش ملیح آبادی ایسی کسی چیز کے قائل نہ تھے۔ جو عمل، جو عقیدہ اور جو چیز عقل تسلیم نہ کرے وہ اس کو نہیں مانتے تھے اسی طرح کی چیزوں کی وجہ سے وہ معاشرے کی کئی روایات سے انحراف کرتے تھے اور وہ معاشرے کے ساتھ چلنے کے عادی نہیں تھے۔ تہذیبی تناظر میں وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس دور میں نوابوں اور امیروں کا استقبال کیسے کیا جاتا تھا یہاں تک کہ نوابین کے بچوں کو بھی پر تکلف طریقے سے مدعو کیا جاتا تھا اور ان کا بھی بڑے لوگوں کی طرح استقبال کیا جاتا تھا اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ نوابین کی کس قدر خدمت کی جاتی تھی اور کیسے روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا تھا وہ بھی صرف نوابین کو خوش کرنے کے لیے یہ تمام کام سرانجام دیے جاتے تھے کیونکہ عوام اور خدمت گار انھیں نوابین کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ اس طرح اپنی تہذیب میں سے جوش یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ان کے زمانے میں رات کو کہانیاں سنانے کا رواج بھی عام تھا جب بڑی محفلیں جمتی تھیں تو ان میں خاص طور پر کہانی سنانے والے موجود ہوا کرتے تھے جو محفل کو لطف اندوز کرنے کے لیے وہاں موجود ہوتے تھے اور یہ ایک خاص عصر تھا۔ کہانی سنانے کا ایک خاص انداز تھا جس کو جوش نے نقل کیا ہے:

"اور ہائے مواقع و مناظر کا بیان کرتے وقت کہانیاں کہنے والوں کے وہ بار بار نئے نئے روپوں میں ڈھلتے چہرے، آنکھوں کے بار بار بدلتے اشاروں اور حسب حال بڑھتے گھٹتے ابھرتے ڈوبتے لہجوں کے کٹاؤ اور ٹھہراؤ کے ساتھ وہ کہانیوں کا ان الفاظ میں آغاز "کہانی سی جھوٹی

کوئی بات نہیں کہانی سی میٹھی کوئی چیز نہیں۔ جھوٹ سچ کہانی بنانے والے کی گردن پر کہانی
بنانے والے پر عذاب سننے والوں کو ثواب۔" (۲۴)

"یادوں کی برات" دراصل جوش ملیح آبادی کی ستر سالہ زندگی کے تجربات، مشاہدات اور
فکری ارتعاشات کا ایسا درختاں مرقع ہے جس میں ایک پوری صدی کی سانسیں، آوازیں اور رنگ سمٹے
ہوئے ہیں۔ یہ آپ بیتی محض ایک فرد کی زندگی کا احوال نہیں بلکہ برصغیر کے تہذیبی، فکری اور سماجی ارتقاء
کی زندہ دستاویز ہے۔ اس میں جوش نے اپنے زمانے کے قدیم و جدید میلانات، علمی و ادبی رجحانات، سماجی
اقدار، رسوم و رواج، تہواروں، موسموں اور رہن سہن کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جو پڑھنے والے کے
سامنے ایک مکمل عہد کو مجسم کر دیتی ہیں۔

یہ تصنیف فکر و فن کی رفعتوں، نظریات کی کشش، اور شعر و حکمت کے نادر زاویوں سے مزین ہے۔
اس میں جگہ جگہ دلچسپ واقعات، زندہ کرداروں کے خاکے، تاریخی حوالے، اور زندگی کی گہری بصیرتیں
بکھری ہوئی ہیں، جو کتاب کو ایک غیر معمولی ادبی حیثیت عطا کرتی ہیں۔ یوں "یادوں کی برات" صرف
جوش کی زندگی کا بیان نہیں بلکہ ان کے عہد کی تہذیبی روح، فکری جہات اور سماجی تغیرات کا آئینہ ہے۔ ایک
ایسا آئینہ جس میں ماضی کی روشنی اور حال کا شعور بیک وقت جھللاتا دکھائی دیتا ہے۔

"یادوں کی برات جوش ملیح آبادی کے ستر سال کے تجربات اور مشاہدوں کا
ایک ایسا مرقع ہے جس میں ایک پوری صدی سانس لے رہی ہے، یہ ایک
پورے عہد اور زمانے کا ایک ایسا دلچسپ آئینہ ہے جس میں قدیم و جدید سماجی،
علمی اور تہذیبی اقدار کا سلسلہ ہے جس تیوہاروں، موسموں، رہن سہن اور
رسوم و رواج کا تفصیلی بیان ہے۔ فکر و فن، نظریات پر گفتگو، شعر و حکمت کے
زاویے بے شمار دلچسپ واقعات، حوالے، خاکے اور قصے ہیں جن کی وجہ سے
کتاب اپنے آپ میں بہت اہم اور وقیع بن گئی۔" (۲۵)

اس تصنیف میں جوش ملیح آبادی نے اپنی زندگی کے تجربات اور یادوں کو نہایت دلکش اور بیانیہ
انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی نثر میں کہانی سنانے کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ وہ پہلے تمہید باندھتے ہیں، فضا
قائم کرتے ہیں، اور سامع یا قاری کو پوری طرح متوجہ کرنے کے بعد اصل واقعہ بیان کرتے ہیں۔ یہی روایت
ان کی تحریر کو زبانی ادب، داستان گوئی اور مقامی حکایتوں کی روایت سے جوڑ دیتی ہے۔ ان کی آپ بیتی میں

جہاں تہذیبی زندگی کے گونا گوں رنگ جھلکتے ہیں، وہیں تہواروں کا ذکر اس تہذیب کی روح کے طور پر نمایاں ہے۔

ہندوستان کی سرزمین پر مذہب اور قومیت سے بالاتر ہو کر تہوار منائے جاتے تھے۔ ہندو خوشی سے مسلمانوں کے ساتھ عید مناتے تھے اور مسلمان اسی خلوص سے ہولی اور دیوالی میں شریک ہوتے تھے۔ سب تہوار اہتمام، محبت اور باہمی احترام کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ یہی اس خطے کی مشترکہ ثقافت کی پہچان تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دیوالی پر پورا گاؤں چراغوں سے جگمگا اٹھتا تھا، ہر گھر میں روشنی، خوشبو اور مسرت کا سماں ہوتا تھا۔ گھروں کے دروازے رنگولی سے سجے ہوتے، مٹھائیاں بانٹی جاتیں، اور ہر مذہب و طبقے کے لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں جا کر خوشیاں بانٹتے۔ ان مناظر سے نہ صرف ہندوستانی تہذیب کی ہم آہنگی اور رواداری جھلکتی ہے بلکہ یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ انسانیت کی اصل روح باہمی محبت، اشتراک اور مسرتوں کی تقسیم میں پوشیدہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"دیوالی میں ہولی سے زیادہ دھوم دھڑکا ہوا کرتا تھا۔۔۔ آنگن کے ایک گوشے میں بڑے بڑے رنگین گھروندے سے بنائے جاتے تھے۔ ان بلند و خوبصورت گھروندوں کو شیشوں اور چینی کے ٹکڑوں سے سجایا جاتا تھا۔ جن میں مرمرے چڑوے کھٹیاں گئے اور مٹھائی کے حسین اور باریک کھلونے بڑے سلیقے کے ساتھ ہر طرف شن دیے جاتے تھے۔" (۲۶)

یہ تمام تہوار، خواہ وہ ہولی ہوں، دیوالی، شبِ برات یا عید، اپنے عہد کی تہذیبی ہم آہنگی اور باہمی محبت کے مظہر نظر آتے ہیں۔ شبِ برات کے ذکر میں جوش ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچتے ہیں جس میں آسمان آتش بازی کے رنگوں سے روشن ہے، ہر کوچہ و بازار میں جشن کا سماں ہے، اور ہر مذہب و طبقے کے لوگ اس مسرت میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تہوار محض مذہبی نوعیت کے نہیں بلکہ تہذیبی یکجہتی کے نشان تھے، جو اس عہد کے انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑتے تھے۔

اسی ربط میں وہ "لکھنؤ کے سفر" کے عنوان سے اس شہر کی تہذیب و شائستگی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ جوش لکھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لکھنؤ کی ہر گلی، ہر چوک اور ہر زبان کا لہجہ اپنی تہذیبی نزاکت اور نفاست سے آراستہ ہے۔ بول چال میں شستگی، رہن سہن میں نفاست، محفلوں میں شعر و موسیقی کی مہک، اور انسانوں کے رویوں میں ادب و لحاظ یہ سب مل کر لکھنؤ کی تہذیب کا وہ جادو بن دیتے ہیں جس نے جوش کو مسحور کر دیا۔ ان کے بیان سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ لکھنؤ صرف ایک شہر نہیں بلکہ ادب، تہذیب اور حسن سلوک کی ایک مکمل روایت ہے، جو آج بھی جوش کے الفاظ میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔

"کھلونے خرید کر جب میں نے چوک میں قدم رکھا تو عوداگر اور لوہان کی لپیٹوں نے میرا استقبال کیا۔ آگے بڑھا تو سونے چاندی کے ورق کٹنے کی نپی تلی کھٹاکھٹ نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ بیلے کے پھول چپا کے، وہاں سے آگے بڑھا تو کیا بتاؤں کیا کیا دیکھا۔ ہائے تنبیوں کی وہ جھلجھلہتی تری کلاہیں وہ دہلی ٹوپیاں وہ شریق انگر کے وہ گھنے گھنے پئے۔۔۔ وہ چوڑی دارپاجامے شانوں پر وہ ریشمی بڑے بڑے رومال آڑی تر چھی مانگیں۔" (۲۷)

جوش ملیح آبادی نے لکھنؤ کی تہذیب کا ایک ایسا منظر بیان کیا ہے جس سے وہاں کا اوڑھنا بچھونا بھی واضح ہو گیا ہے اور ان کے متعلق جو ایک خاص سجاوٹ کا ذکر ہمیشہ کیا جاتا ہے اس کو بھی اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وہاں کی تہذیب کیسی تھی۔ یہاں تک کہ جوش ملیح آبادی نے لکھنؤی لوگوں کے اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"ہر چند میری لڑکپن کی نگاہوں میں یہ تمام مقامات بڑے عجیب تھے۔۔۔ لیکن ان تمام عجیب مقامات سے بمرحلہ عجیب تر نظر آئے وہ روسا عالمادبا اور شرفا اور شعراء جو میرے باپ کے پاس آتے جاتے تھے یا وہ ان کے وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اللہ اللہ وہ ان کے پچھلے سلام وہ انکی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز وہ انکی تہذیب میں ڈوبی وضع قطع وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش وہ مسال علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام، ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ وہ ان کے لہجوں کا کٹاؤ، اثنائے غزل خوانی میں وہ حسب مفہوم شعر ان کی آنکھوں کا رنگ اور ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ۔" (۲۸)

لکھنؤ کی تہذیب سارے ہندوستان کی تہذیب سے مختلف تھی۔ ان کا رہن سہن اور ان کے آداب کو جوش ملیح آبادی نے جس طرح بیان کیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر طریقے سلیقے کا خیال رکھا جاتا تھا حتیٰ کہ چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے میں بھی تہذیب نظر آتی ہے کہ وہ لوگ کیسے رہتے تھے۔ چھوٹی بڑی بات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ چھوٹوں بڑوں کے احترام کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ادب کو ملحوظ خاطر رکھنا ان کے لیے اولین درجہ رکھتا تھا۔ دشمن کے بزرگوں کا بھی خیال رکھا جاتا تھا ان کا احترام کرنا ہر ایک پر لازم تھا۔ حفظ مراتب کا خیال رکھنا کتنا زیادہ اہم تھا یہ اس وقت کی تہذیب کا حصہ تھا اور بزرگوں کا احترام کرنا کامیابی سمجھا جاتا تھا یعنی ان کا احترام کیے بغیر کامیابی ملنا ممکن نہیں۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی میں ایک مجموعی طور پر ہندوستانی اور انگریز کی تہذیب کا تقابل بھی کیا ہے اور اس کی آڑ میں انگریز کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور ساتھ میں ایسے لوگوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے جو مشرقی لوگ ہیں لیکن انگریز کی پیروی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی اپنی تہذیب کو لے

کر کتنے سنجیدہ تھے اور کسی صورت نہ انگریز کی تہذیب سے متاثر ہوتے تھے اور نہ ہی ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو انگریز کی تہذیب سے متاثر تھے۔

"خالص مشرقی گروہ کے چہروں پر لانی بخشی داڑھیاں تھیں اور سروں پر پٹے پٹوں پر عمامے دستاریں شملے یا دوپلی اور چوگوشیاں ٹوپیاں۔ پاؤں میں گھٹلے یا سلیم شاہی جوتے۔ بڑے پانچوں کے پاجامے یا اور یہیں گھٹنے۔ عبائیں قبائیں انگرکھے دکھلے شانوں اور کمروں پر بڑے بڑے رومال چکن کے کرتے۔" (۲۹)

یہ خالص مشرقی گروہ کی منظر کشی کی گئی ہے کہ وہاں کیا پہنا جاتا تھا اور لوگ اپنی تہذیب کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب سے مرعوب عوام کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"مغربی گروہ سوٹ بوٹ اور ہیٹ میں غرق رہتا تھا۔ لیکن داڑھی کے ساتھ مونچھیں نہیں منڈاتا تھا۔" (۳۰)

جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی برات" میں مشرقی اور مغربی تہذیب کے تقابل کو نہایت دلکش اور گہرے طنزیہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ان کے بیان سے ایک ایسا عہد ابھرتا ہے جب ہندوستان مشرقیت اور مغربیت کے بیچ جھولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف گلی دنڈا، کبڈی، پتنگ بازی اور آنکھ مچولی جیسے سادہ اور خالص ہندوستانی کھیل؛ اور دوسری طرف ہاکی، فٹ بال، ٹینس اور کرکٹ جیسے انگریزی کھیل اپنی جڑیں پھیلا رہے تھے۔ اسی طرح کھانوں میں بھی تہذیبی تفریق نمایاں تھی۔ چلے، تلوئے، سموئے، پاپڑ اور باقر خانی مشرقی ذائقوں کی نمائندگی کرتے تھے، جب کہ سوپ، کٹلٹ، ابلے آلو اور کریم ساس مغرب کی بے روح نزاکت کے مظہر دکھائی دیتے تھے۔ جوش کے ہاں انگریزی کھانوں، لباس اور رہن سہن کے تذکرے میں ایک واضح طنز اور نفرت جھلکتی ہے، گویا وہ کہنا چاہتے ہوں کہ مشرق کی مٹی میں جو سادگی، خلوص اور ذائقہ ہے، مغرب کی نقالی اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ یوں مجموعی طور پر جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی میں نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورے ہندوستان کی تہذیبی روح کو مجسم کر دیا ہے جہاں ہر شہر، ہر منظر اور ہر روایت اپنی مخصوص خوشبو کے ساتھ زندہ دکھائی دیتی ہے، اور قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ صرف ایک خود نوشت نہیں بلکہ پورے برصغیر کی دھڑکتی ہوئی تہذیب پڑھ رہا ہے۔

مذہبی معاملات:

جوش ملیح آبادی کی ذاتی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی خود نوشت "یادوں کی برات" سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے معاملے میں کبھی کسی ایک عقیدے یا مسلک پر مستقل طور پر قائم نہیں رہے۔ ان کی فکری زندگی ہمیشہ تغیر، جستجو اور شعوری ارتقا کی علامت رہی۔ مذہب کے بارے میں ان کا رویہ جذباتی عقیدت سے زیادہ فکری تجسس اور عقلی تفکر پر مبنی تھا۔ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب کو محض عبادات اور ظاہری رسومات کے دائرے میں قید نہیں دیکھتے تھے بلکہ اسے ایک ذاتی اور فکری تجربے کے طور پر برتتے تھے۔ ان کی آپ بیتی میں ایسے کئی مقامات ملتے ہیں جہاں مذہب سے ان کے تعلق کی نوعیت بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی وہ عبادات کی طرف مائل نظر آتے ہیں اور کبھی فکری بغاوت کے جوش میں مذہبی جکڑ بندیوں کو چیلنج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی تضاد دراصل ان کی فکری وسعت، ذہنی بے قراری اور حقیقت کی تلاش کی علامت ہے۔

مذہب کے بارے میں اپنا عقیدہ بیان کرتے ہوئے جوش ایک نہایت جرات مندانہ اور بے خوف لہجے میں لکھتے ہیں: "اک جری انسان کی مانند، میں با آواز بلند یہ اعلان کرتا ہوں جو ادھر دیکھ رہا ہے وہ ادھر مڑ جائے جو دور ہے وہ قریب آجائے جس نے اب تک نہ سنا ہو وہ کان کھول کر سن لے جو اب تک مجھ کو مومن سمجھ رہا ہے وہ اپنے حسن ظن سے دست بردار ہو جائے اور جس کے نزدیک میں خدا کا منکر، یعنی لفظ خدا کے لا محدود معنی میں منکر ہوں وہ بھی اپنے سو ظن سے توبہ کر لے کہ میرا دین خیابان ذہن انسانی کی تمنائے رنگ و بو، حصول علم و فقدان، جہل کی آرزو کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔" (۳۱)

درج بالا اقتباس جوش ملیح آبادی کے فکری رویے اور مذہب کے بارے میں ان کی انقلابی سوچ کا مظہر ہے۔ یہاں جوش نے مذہب کو تقلیدی یا عقیدتی دائرے سے نکال کر ایک فکری اور تخلیقی جستجو کے عمل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک مذہب کوئی جامد نظام نہیں بلکہ انسانی ذہن کی اس ازلی پیاس کا استعارہ ہے جو علم، حقیقت اور کائنات کے اسرار تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مسلسل متحرک رہتی ہے۔ جوش کا یہ بیان ان کی آزاد خیالی، خود آگاہی اور فکری خود مختاری کی معراج ہے۔ وہ اپنے قاری سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مذہب کو صرف ظاہری عبادات یا مسلمات کے پیمانے پر نہ پرکھے بلکہ اسے انسان کے باطن، علم اور روحانی جستجو کے آئینے میں دیکھے۔ ان کے نزدیک ایمان کی اصل روح علم کی تلاش، جہل کا انکار اور حقیقت

کی تلاش میں مسلسل سفر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کا مذہبی شعور محض عقیدے کا نہیں بلکہ انسان کی فکری آزادی اور جستجوئے حق کا استعارہ بن جاتا ہے۔

جوش کے نزدیک مذہب کا تعلق عقیدت سے ہے۔ فقط عقائد کا عقیدت کی بنا پر پرستار ہونا کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ وہ مذہب اور مذہبی رہنماؤں سے اس لیے خائف ہیں کہ ان کے نزدیک ان باتوں کو عقل تسلیم نہیں کرتی سو ان سے روگردانی کی جائے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں موجود مذہبی رہنماؤں سے اس لیے خائف ہیں کہ یہ طبقہ کسی بھی انسان کے لیے فوری طور پر کفر کے فتوے جاری کرتا ہے۔ سب سے زیادہ طنز و طعنوں کے تیر اسی حلقے سے آتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے طنز کرنے والوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ جو معاشرے میں مذہب کے علمبردار بنے ہوئے ہیں وہ دوسروں پر ہی باتیں کرتے ہیں۔ جوش نے اپنے نظریے کی وضاحت بھی کی ہے کہ وہ ایسے نظریے کے پیروکار کیوں ہیں اس لیے کہ جس معاشرے میں انھوں نے آنکھ کھولی وہاں کی روایات ایسی ہیں کہ جن کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ایسے مذہبی علمبردار جو مذہب کو توہم پرستی اور اوہام کی لپیٹ میں لا کر بیان کرتے ہیں اس کی وجہ سے ان کی مذہب کی طرف سے بے زاری مزید بڑھ گئی۔ کشف، کرامات، عقیدت اور عقائد سے جوش ملیح آبادی نے کبھی صلح نہیں کی۔ جوش ملیح آبادی دنیاوی باتوں کے علاوہ اکثر مرنے کے بعد کی زندگی کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یعنی ایک مذہب جو مرنے کے بعد جنت، جہنم کا تصور دیتا ہے وہ ان چیزوں کو مافوق الفطرت عناصر سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو بھی بات ان کے عقل کے دائرے میں نہیں آتی اس کو انھوں نے نکال باہر پھینکا۔ وہ اس کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ: "اے مفکر دوستو، اظہار حقیقت میں شرمانا کیسا، میں تم سے اپنے دل کا یہ چور بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب کبھی آباء و اجداد مجھ کو پکڑ لیتے ہیں تو میرا جی چاہنے لگتا ہے کہ انھوں نے جو مافوق الفطرت باتیں مجھ سے کہی تھیں اللہ کرے وہ ساری کی ساری سچ نکلیں مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ملوں شافع محشر سے اپنے سارے گناہ معاف کرا کے جنت میں جاؤں حوض کوثر کے کنارے جام پر جام لٹھاؤں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سن لیجیے کہ ان کمزور لمحوں کے روز سے جب میری معقل جھانک کر مجھ کو دیکھ لیتی ہے تو میرے مرجھائے گالوں پر تڑاق سا تھپڑ مار کر مجھ سے کہتی ہے کہ ستر بہتر کے بڈھے بول تو نا بالغ کب تک رہے گا۔" (۳۲)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز جو عقل کے دائرہ کار میں نہیں آتی اس سے وہ انحراف کرتے ہیں۔

مذہب سے متنفر اس لیے بھی ہیں کہ ان کے نزدیک مذہب انسانیت کو تقسیم کرتا ہے۔ ایک مذہب کا انسان دوسرے مذہب کے انسان کو انسان نہیں سمجھتا، تحقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یعنی مذہب تفریق پیدا کرتا ہے جس سے آپس کی نفرتوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک طرف ان کا مذہب کے معاملے میں یہ نظریہ ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مذاہب کے بتائے ہوئے عقائد کو عقل تسلیم نہیں کرتی اس لیے اس کے مطابق چلنا بے سود ہے دوسری طرف جب مذہب کے حوالے سے اہم شخصیات کا ذکر آتا ہے تو وہاں پر وہ محبت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے دین اسلام کی کچھ اہم شخصیات کا ذکر کیا ہے۔

اس ضمن میں جوش ملیح آبادی سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ کا ذکر کرتے ہیں اور ان کا ایک جاہل قوم میں پیدا ہونا اور اس قوم کو پھر اصلاح کی طرف لے کر جانا ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی خود نوشت "یادوں کی برات" میں مذہب، فلسفہ، انسانیت اور سوشلزم کے باہمی تعلق کو ایک منفرد فکری انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ مذہب کو اندھی عقیدت یا جامد رسومات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری تجربہ اور اخلاقی رہنمائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل انسانیت وہ ہے جو عقل، علم اور اخلاق کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔ اسی نظریے کے تحت وہ سقراط، نبی اکرم ﷺ، حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ جیسے کرداروں کا ذکر کرتے ہیں۔ سقراط کی مثال دیتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ علم کی اصل فضیلت یہ نہیں کہ انسان بڑی بات کہے بلکہ یہ کہ وہ اپنے علم کو لوگوں کی فکری سطح کے مطابق مؤثر انداز میں منتقل کرے۔ یہی حکمت نبی اکرم ﷺ کے اسوہ میں نظر آتی ہے کہ آپؐ نے انسانی فہم کے مطابق دین کی دعوت دی، جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ اسی تسلسل میں جوش حضرت علیؑ کے علم و شجاعت کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ وہ واحد ہستی تھے جن میں عقل کی روشنی اور تلوار کی جرات دونوں یکجا تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کی تربیت نے ان کی شخصیت کو وہ کمال بخشا کہ رہتی دنیا تک ان کے علم و عمل کی مثال قائم رہے گی۔ اس کے بعد جوش حضرت حسینؑ کی قربانی کو حق و صداقت کی اعلیٰ ترین تمثیل قرار دیتے ہیں۔ وہ قربانی جو ظلم کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کی علامت بن گئی۔ جوش ان تمام مقدس شخصیات کا ذکر مذہبی عقیدت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کی انسان دوستی، کردار کی عظمت، اور اخلاقی استقامت کے باعث کرتے ہیں، اور یہی ان کے نزدیک دین کا حقیقی مفہوم ہے۔

مصنف مذہب کی اصل روح سے انکار نہیں کرتے بلکہ اس مذہبیت سے بیزار ہیں جو انسانوں کو طبقات، عقائد اور فرقوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ان کی آپ بیتی سے یہ تاثر واضح ملتا ہے کہ وہ زہد و عبادت کے

ادوار سے بھی گزرے لیکن جب انھوں نے سماج میں بھوک، افلاس اور نا انصافی کے مناظر دیکھے تو ان کا دل رسمی عبادت سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ سمجھنے لگے کہ مذہب اگر انسان کو انسان سے قریب نہیں کرتا تو وہ محض ظاہری نمائش ہے۔ یہی سوچ انھیں سوشلزم کی طرف مائل کرتی ہے۔ ایک ایسا نظام جو برابری، عدل اور انسانی مساوات کا علمبردار ہے۔ جوش کے نزدیک سوشلزم مذہب کی مخالفت نہیں بلکہ اس کی حقیقی روح کا تسلسل ہے، کیونکہ ان کے نزدیک انسانیت سے بڑھ کر کوئی دین نہیں۔ یوں ان کی فکر کا محور خدا یا مذہب سے انکار نہیں بلکہ اس نظام مذہب سے انکار ہے جو انسان کو غلام بناتا ہے، اور ان کی انسان دوستی کا یہی پہلو انہیں ایک بلند پایہ فکری اور اخلاقی مفکر کے طور پر ہمیشہ یاد گار بناتا ہے۔

اخلاقی اقدار:

جوش ملیح آبادی کی خود نوشت "یادوں کی برات" میں اخلاقی اقدار اور انسان دوستی کا تصور بڑی شدت اور خلوص کے ساتھ ابھرتا ہے۔ وہ انسانیت کو مذہب اور عقیدے سے کہیں زیادہ مقدس مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اخلاق کا اصل جوہر یہ ہے کہ انسان دوسرے انسان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھے، اس کے لیے آسانیاں پیدا کرے، مظلوم کا ساتھ دے، اور ظلم و نا انصافی کے خلاف آواز اٹھائے۔ جوش کی نظر میں عبادت، ریاضت یا رسمی تقویٰ سے زیادہ اہم وہ کردار ہے جس میں انسان دوسروں کے لیے درد مند دل رکھتا ہو۔ وہ انسان دوستی کو اخلاقیات کی معراج قرار دیتے ہیں اور اسے ہی مذہب کی حقیقی روح سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ انسان جو انسانیت سے محبت نہیں کرتا، دراصل ایمان کے مفہوم سے بھی ناواقف ہے۔

جوش مذہب کی ظاہری تشریحات سے ہٹ کر اس کی باطنی روح کو سامنے لاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ خدا کی نظر میں اصل برائی وہ نہیں جو عقیدے کے اختلاف سے پیدا ہوتی ہے، بلکہ وہ ہے جو انسانیت کے حقوق پامال کرنے سے جنم لیتی ہے۔ ان کے نزدیک ایمان کا معیار عبادات نہیں بلکہ انسان دوستی ہے، اور جوش اسی فکر کو اخلاقیات کا سب سے بلند درجہ سمجھتے ہیں۔ یوں ان کی آپ بیتی محض ایک شخص کی زندگی کا احوال نہیں بلکہ انسانی شرافت، اخلاقی احساس اور دردِ دل کی دعوتِ عمل بن جاتی ہے۔ ایک ایسی فکری و اخلاقی دستاویز جو انسان کو انسان سے جوڑنے کا پیغام دیتی ہے۔ اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ ہو:

"اے مجھے "کافر باللہ" کہنے والو تم کو معلوم نہیں کہ کافر مومن بالانسان ہے۔ خود تمہارا دین کہتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ کافروں کو معاف کر دے، لیکن حقوق العباد کے پامال کرنے والے یعنی کافر بالانسان کی بخشش کے بارے میں، خدا نے اپنا اقتدار بندوں کو

بخش دیا ہے۔ اور جب تک مظلوم، اپنے ظالم کو معاف نہیں کرے گا اسے بخشا نہیں جائے گا۔" (۳۳)

جوش عشق سے زیادہ انسانیت کے ساتھ ہمدردی کو اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں اس ضمن میں عاشق و محبوب اور حب انسانی کا ایک طرح سے موازنہ کیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانیت کی خدمت، عشق کی تکلیف سے زیادہ بڑی ہے کہ عاشق تب تک تکلیف میں مبتلا رہے گا جب تک محبوب اس سے غافل ہے جیسے ہی عاشق کو محبوب کی توجہ حاصل ہوئی اس کا کرب ختم ہو گیا لیکن ایک ایسا انسان جس کو انسانیت کا کرب ہے وہ کبھی سکون نہیں پاسکتا کیونکہ جب تک وہ ساری انسانیت کو پر سکون نہ دیکھ لے وہ پر سکون نہیں ہو سکے گا۔ اس کو اگر مختصر طور پر بیان کریں تو ایک احساس سے پر دل ہی انسانیت سے محبت کرے گا اور ایک کے بجائے سب کے بارے میں سوچے گا۔ ایک درد مند دل اگر کسی آسائش میں ہے تو وہ آس پاس ضرور نظر دوڑائے گا کہ کوئی ضرورت مند ہے تو اس کو یہ آسانی مہیا کی جائے۔ احساس سے خالی انسان صرف اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں کیے گئے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان دوست تھے دوسروں کے بارے میں سوچنے والے اور احساس والے انسان تھے۔

اس قدر دوسروں کے بارے میں سوچتے تھے اور ہر اچھے کام پر وہ انسانیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اخلاقی اقدار میں وہ مساویانہ سلوک اور مساویانہ حقوق کی بات کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں تمام عالم ایک قوم ہے وہ چاہتے ہیں ساری انسانیت ایک قوم بن کر رہے۔ اس ضمن میں وہ ارباب سیاست اور ارباب مملکت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ یہی لوگ ہیں جو انسانیت کو تقسیم کرنے کا باعث ہیں اور جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں کہ انسان برادری اور مذہب کی وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں۔ یہ طبقہ انسان کو تفریق میں ڈال کر ان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ جوش کے نزدیک مذہب، ذات اور برادری سب ایسی چیزیں ہیں جو انسانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتی ہیں۔ اپنی آپ بیتی میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"فوجی درندگی کے بل بوتے پر فتنے برپا کرنے والے ارباب سیاست کا یہ خیال ہے دانائی اس

میں ہے کہ نادانوں کو، ثقافت، اسان، اوطان، اور ادیان میں الجھا کر چھوٹی چھوٹی برسر جنگ

ٹولیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔" (۳۴)

جوش جنگ کی اصطلاح کو بھی ناپسند کرتے ہیں اس کی وجہ یہ کہ جنگ میں انسان کٹتے ہیں مرتے ہیں۔ کوئی بیوہ ہو جاتی ہے کوئی یتیم ہو جاتا ہے کوئی معذور ہو جاتا ہے اور ہر ایک کسی نہ کسی مشکل کا سامنا کرتا ہے۔ وہ جنگ چھیڑنے والے اور جنگ کی تیاریاں کرنے والوں پر سخت ناراض ہیں اور ایسے طبقے کو وہ قابل

نفرت سمجھتے ہیں۔ جوش جنگ کو ناپسند کرتے ہیں جوش ملیح آبادی نے ذات، برادری، مذہب اور وطن، غرض یہ کہ ہر عنصر پر انسانیت کو ترجیح دی ہے۔ سب سے پہلے انسان اہمیت کا حامل ہے چاہے وہ کسی ملک سے ہے کسی قوم سے ہے کسی بھی مذہب یا فرقے سے ہے اس کی سب سے اہم پہچان یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہے۔

یہ سب عناصر اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں لیکن انسان ان چیزوں کی آڑ میں اکثر دوسرے کو انسان سمجھنے سے بھی گریز کرتا ہے۔ کسی کی مدد کرنے میں بھی ان چیزوں کی رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے جب کہ ہر مذہب اخلاقیات کا درس دیتا ہے لیکن انسان مذہب کی وجہ سے خود غرض بھی ہو جاتا ہے اسی وجہ سے جوش ملیح آبادی نے انسانیت کو ہر جگہ اہمیت دی ہے۔ انسان کو انسان سمجھنا، اس کا خیال رکھنا، ایک دوسرے کی بوقت ضرورت مدد کرنا، آسانیاں فراہم کرنا اور ہمدردی بانٹنا مذہب اور برادری ازم سے زیادہ اہم ہے۔

"بطور انسان سبھی برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر نسل، ذات، علاقہ، پیسہ، رنگ، نسل اور زبان کی وجہ سے کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔" (۳۵)

ذاتی طور پر جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی میں اخلاقی اقدار کی جو کھل کر بات کی ہے وہ انسانیت تک محدود ہے۔ جب اخلاقیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو سمجھ آتی ہے کہ اخلاقی اقدار انسانیت کے گرد ہی گھومتی ہیں کیونکہ ان کا تعلق انسان سے۔ انسانیت کو اہم سمجھا جائے تو باقی اقدار خود بخود سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور انسان ان کو اپنانے میں بھی آسانی محسوس کرتا ہے۔ جیسا کہ ادب و احترام، حفظ مراتب کا خیال رکھنا اور اس کے جیسی دوسری اچھائیاں بھی انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ جب وہ خاندانی لحاظ سے بیان کرتے ہیں تو اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اخلاقی اقدار ان میں خاندانی تعلق کی وجہ سے تھیں۔ اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ لوگوں کی بہت زیادہ مدد کرتے تھے۔ کئی بار کسی کو پتہ بھی نہیں ہوتا تھا اور ان کے والد دوسرے لوگوں کی مدد میں مصروف رہتے تھے۔ اس بات کو سب جانتے ہیں کہ پہلے زمانے کی دشمنی کتنی زیادہ سخت تھی لیکن ان کے والد گرامی اس دور میں اپنے دشمنوں کی مدد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جس کی مدد کی جاتی تھی اس کی عزت نفس کا بھی خیال رکھا جاتا تھا کہ اس کو یہ بھی نہ محسوس ہو کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج ہے۔ اس ضمن میں جوش ملیح آبادی بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد جس کی مدد کرتے تھے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرتے تھے کہ سامنے والا انسان شرمندہ نہ ہو جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خاصیتیں صرف جوش ملیح آبادی کا خاندان میں نہیں تھیں بلکہ وہ دور ایسا تھا کہ دشمنی کے باوجود دوسروں کی مدد کرتے وقت اختلاف بھی بھلا دیے جاتے تھے کیونکہ انسانیت کو اولین درجہ حاصل تھا۔ یہ اقدار اس زمانے کے ہر انسان میں پائی جاتی تھیں۔

معاشی حالات و واقعات:

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی میں معاشی حالات کے حوالے سے بہت کم ذکر ملتا ہے۔ آپ بیتی کے آغاز میں مجموعی طور پر مختصر سا ذکر ملتا ہے جہاں انھوں نے سرمایہ داری نظام کے بارے میں لکھا ہے۔ جوش ملیح آبادی سرمایہ دارانہ نظام کے سخت خلاف تھے اور سوشلزم کے حامی تھے۔ یہی بڑی وجہ تھی کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے کیونکہ سوشلزم معاشرے میں ہر سطح پر برابری کی بات کرتا ہے چاہے وہ انسانی حقوق ہوں یا دولت کی بات ہو۔ ہر طرح سے مساویانہ نظام کو اہمیت دی جاتی ہے لیکن سرمایہ داری نظام میں برابری کا تصور نہیں ہے اس طریقہ سے معاشرے کا ایک غریب انسان غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور امیر انسان امیر تر بنتا چلا جاتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"سرمایہ داری نظام، ایک زبردست تن و توش جو تک کی مانند عامۃ الناس کی گردن میں منہ گاڑے بڑے مزے لے لے کر ان کا خون چوس رہا ہے۔ اس منحوس نظام نے آنکھوں سے مردت لہجے سے نرمی خیالات سے ہمدردی اور دلوں کی دھڑکنیں چھین لی ہیں، اور ہوس کاروں کو ٹھوس چٹانوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ یقین فرمائیے کہ جب تک آدمی حجاج، ہلاکو، چنگیز، نادر، اور یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا سرمایہ دار صنعت کار بن ہی نہیں سکتا۔" (۳۶)

جوش ملیح آبادی نے سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں بتایا ہے کہ معاشرے کے اونچے طبقے کے لوگ اور اثر رسوخ والے لوگ کسی نظام کو اگر قبول نہ کرنا چاہیں تو وہ نظام ترقی کر ہی نہیں سکتا یعنی سرمایہ دارانہ نظام سے حکومت تعاون کرتی ہے۔ تب ہی یہ لوگ اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں جس کا غریب انسان پر منفی اثر پڑتا ہے۔

"سرمایہ دارانہ نظام نے سود کا خوگر بنا دیا ہے اور وہ افزائش دولت کے جذبے سے سرشار ہے۔ وہ اپنی کامیابی اس میں منحصر سمجھتا ہے۔ اور اس نظام سے فقراء اور محتاجوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔" (۳۷)

ملک میں حکومتی طبقہ اور اثر و رسوخ والے لوگوں کا غریب انسان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ نچلے طبقے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ جوش نے سرمایہ داری نظام کے ساتھ حکومتی طبقے کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اس نظام کے رویے کو آشکار کیا ہے۔ اس طرح جوش کی آپ بیتی میں معاشی معاملات کے متعلق بہت زیادہ نکات نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ جوش کی اپنی زندگی میں جو معاشی تنگی رہی اس کا ذکر ہے۔ نظام

حیدرآباد میں ملازمت کی اور ایک نظم لکھنے کی وجہ سے وہاں سے نکال دیے گئے۔ دہلی سے کلیم " کے نام سے رسالہ جاری کیا اس میں بھی نقصان ہوا۔ فلمی دنیا میں گیت لکھتے رہے وہاں سے بھی کچھ عرصے بعد چھوڑ دیا۔ اس کے بعد پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد بھی ان کو معاشی تنگی کا سامنا رہا۔ پاکستان میں اردو لغت بورڈ کا کام شروع کیا اس میں بھی اختلافات کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی۔

یادوں کا جشن اور یادوں کی برات میں سماجی و عصری حالات و واقعات کا تقابل

یادوں کا جشن اور یادوں کی برات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر ان کا تقابل کریں تو دونوں آپ بیتیوں میں اشتراکات اور افتراقات پائے جاتے ہیں۔

اشتراکات

۱. کھانے، لباس، رہن سہن کا ذکر دونوں آپ بیتیوں میں یکساں طور پر بیان ہوا ہے۔
۲. اخلاقی اقدار میں ادب و احترام کے اصول بھی یکساں اہمیت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں جہاں گھر کے اندر ہو یا باہر، ہر جگہ حفظ مراتب کا لحاظ رکھنے کی تلقین ایک ہی سنجیدہ اور متوازن انداز میں کی گئی ہے۔
۳. انسانیت کا ذکر اور احترام بھی دونوں آپ بیتیوں میں پایا جاتا ہے۔
۴. معاشی معاملات کے ضمن میں دونوں آپ بیتیوں میں سرمایہ داری کو برا سمجھا گیا ہے۔
۵. انسانیت اور خدمتِ خلق کا جذبہ دونوں آپ بیتیوں میں یکسانیت کا حامل ہے۔

افتراقات

۱. علاقائی اعتبار سے جوش ملیح آبادی نے لکھنؤی تہذیب کو موضوع بنایا ہے اور مشرقی و مغربی تہذیب کا تقابل بھی کیا ہے جب کہ مہندر سنگھ بیدی کے ہاں مجموعی طور پر تہذیب کا ذکر موجود ہے۔
۲. جوش ملیح آبادی پٹھان قبیلے سے تعلق رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس ذات کے خصائص کا الگ سے بھی ذکر کیا ہے جبکہ مہندر سنگھ بیدی کے ہاں ایسا بیان نہیں ملتا۔

۳. جوش ملیح آبادی نے اخلاقیات کو اپنانے کی بات کی ہے اور مہندر سنگھ بیدی نے گھریلو زندگی سے لے کر معاشرتی زندگی تک کی اخلاقیات کا بھی ذکر کیا ہے اور اخلاقی برائیوں کے متعلق بھی وضاحت دی ہے۔

۴. مہندر سنگھ بیدی مذہبی لحاظ سے کافی سنجیدہ تھے۔ عقائد و روایات کو اہم سمجھتے تھے۔ عبادت اور مذہبی علماء کی عزت کرتے تھے اور خود بھی ان عناصر کا خیال رکھتے تھے۔ جبکہ جوش ملیح آبادی مذہب کے لحاظ سے ہمیشہ کشمکش کا شکار رہے کبھی خدا سے لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں کبھی زہد اختیار کرتے ہیں اور کبھی مکمل طور پر ہر چیز سے انحراف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر تولتے ہیں اور ہر عقیدے سے اس بنیاد پر خائف ہیں۔

دونوں آپ بیتیوں کا مطالعہ کیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف شخصی زندگیوں کا بیان نہیں بلکہ اپنے اپنے عہد کی تاریخ اور سماج کا معتبر دستاویزی خاکہ بھی ہیں۔ ان میں مصنفین نے اپنے زمانے کے سیاسی اتار چڑھاؤ، سماجی کشمکش، تہذیبی رنگارنگی اور فکری انقلاب کو اس فنی مہارت سے سمویا ہے کہ ان کے دور کی پوری فضا قاری کے سامنے مجسم ہو جاتی ہے۔ ان تحریروں میں فرد کی ذات، عہد کے اجتماعی شعور سے الگ نہیں بلکہ اس کا جزو بن کر سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آپ بیتیوں میں ایک طرف انسان کی داخلی دنیا کی جھلک ہے تو دوسری طرف بیرونی دنیا کے ہنگاموں کا عکس۔ یوں یہ تصانیف اپنے دور کے سیاسی و سماجی شعور کا جیتا جاگتا استعارہ بن جاتی ہیں اور ہمیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ ادب، محض لفظوں کی آرائش نہیں بلکہ زمانے کی ترجمانی کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱. شاہد حسین ڈار، ادب سماج اور کلچر، (اردو ریسرچ جرنل، ۲۰۲۰ء)۔
۲. فیروز الدین، مولوی، فیرو ز اللغات اردو جامع، (لاہور: فیروز سنز، بار اول ۲۰۰۵ء)، ص ۹۵۰۔
۳. محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی، مونوگراف کنور سنگھ بیدی سحر، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۲۱ء)، ص ۲۶۔
۴. حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تہذیب و تحقیق، (لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۵ء)، ص ۲۰۰۔
۵. ظہور عالم، شیخ، تہذیب و ثقافت کا تصور اور اردو ادب، (اردو ریسرچ جرنل، ۲۰۲۲ء)۔
۶. ثقافت اور تہذیب کے مفاہیم کا معنوی اور صوری جائزہ، -nisar/390666/، <https://www.humsub.com.pk/>، بتاریخ، اپریل، ۲۰۲۵ء، بوقت ۳:۳۵ بجے / ali-bhatti-2
۷. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، (جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء)، ص ۸۸۔
۸. ایضاً، ص ۹۰۔
۹. ایضاً، ص ۱۸۳۔
۱۰. ایضاً، ص ۵۰۴۔
۱۱. نارنگ ساقی، عقیل احمد، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر-فن اور شخصیت، (نئی دہلی: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریچر ٹرسٹ، ۲۰۲۳ء)، ص ۳۸۵۔
۱۲. ایضاً، ص ۱۳۹۔
۱۳. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، (جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء)، ص ۶۶۔
۱۴. ایضاً، ص ۲۴۷۔
۱۵. ایضاً، ص ۲۴۹۔
۱۶. ایضاً، ص ۲۵۴۔
۱۷. ایضاً، ص ۲۵۵۔
۱۸. ایضاً، ص ۸۴۔

۱۹. انوار احمد خاں، اردو میں آپ بیتی نگاری کا آغاز و ارتقاء، (مہاراشٹر: اشاعت گھر، ۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء)، ص ۱۱۲

۲۰. جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، (کراچی: جوش اکیڈمی، ۱۹۷۲ء)، ص ۳۰۔

۲۱. ایضاً، ص ۳۰۔

۲۲. ایضاً، ص ۳۱۔

۲۳. ایضاً، ص ۳۲۔

۲۴. ایضاً، ص ۵۸۔

۲۵. حسن عبدالکریم، اردو کی اہم آپ بیتیاں، (دہلی: دستاویز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۴۰۔

۲۶. جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، (کراچی: جوش اکیڈمی، ۱۹۷۲ء)، ص ۷۰۔

۲۷. ایضاً، ص ۸۴۔

۲۸. ایضاً، ص ۸۶۔

۲۹. ایضاً، ص ۱۷۱۔

۳۰. ایضاً، ص ۱۷۱۔

۳۱. ایضاً، ص ۲۹۱۔

۳۲. ایضاً، ص ۲۹۳۔

۳۳. ایضاً، ص ۱۹۔

۳۴. ایضاً، ص ۲۳۔

۳۵. محمد منظور عالم، ڈاکٹر، تکریم انسانیت اور مسلمانوں کی ذمہ داری، (مضمون)، مشمولہ

:نقطہ نظر، ۲۰۱۶ء، ص ۳۶

۳۶. جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، (کراچی: جوش اکیڈمی، ۱۹۷۲ء)، ص ۲۴۔

۳۷. علی شاہ بخاری، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے

موازنہ، (کوہاٹ: جامعۃ العلوم، ۱۹۸۳ء)، ص ۲۵۔

باب چہارم:

یادوں کا جشن اور یادوں کی برات میں
پیش کردہ ادبی منظر نامے

باب چہارم:

یادوں کا جشن اور یادوں کی برات میں پیش کردہ ادبی منظر نامے

کسی بھی معاشرے کو سمجھنے اور جاننے کے لیے ادب بنیادی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ ادب محض تخلیقی اظہار نہیں بلکہ اپنے عہد کے شعور، رویوں اور اقدار کا آئینہ ہوتا ہے۔ ادب معاشرے کی عکاسی دو سطحوں پر کرتا ہے۔ ایک طرف وہ عصر حاضر کے سیاسی، اخلاقی، معاشی اور سماجی حالات کی نمائندگی کرتا ہے، یہ دکھاتا ہے کہ معاشرہ کس سمت میں بڑھ رہا ہے، کن مسائل سے دوچار ہے اور انسانی قدروں میں کس نوع کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ دوسری طرف ادب ماضی کے حالات و واقعات کو محفوظ کر کے آنے والی نسلوں تک پہنچاتا ہے تاکہ وہ اپنے ماضی سے رشتہ جوڑ سکیں اور حال و مستقبل کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

"شاید تمام انسانی ایجادات میں سب سے بڑی ایجاد ادب ہے، جس نے ان لوگوں کو جو ایک دوسرے کو کبھی نہ جان پاتے باہم روشناس کرایا، مختلف ادوار کی کتابیں وقت کی بیڑیاں توڑ دیتی ہیں۔" (۱)

ادب کی مختلف اصناف شاعری اور نثر اس عکاسی میں اپنے اپنے انداز سے کردار ادا کرتی ہیں۔ نثر میں بھی افسانوی اور غیر افسانوی نثر کا اسلوب اور طرزِ اظہار الگ الگ ہے۔ افسانوی نثر مثلاً ناول یا کہانی میں حالات کو فرضی کرداروں اور واقعات کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے، جیسے سرسید تحریک کے زیر اثر مولوی نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں میں اس وقت کے مسلم معاشرے کی اصلاحی ضرورتوں اور سماجی کمزوریوں کو علامتی و تمثیلی پیرائے میں پیش کیا گیا۔ اس کے برعکس غیر افسانوی نثر میں، خصوصاً آپ بیتی میں، حالات و واقعات براہِ راست مصنف کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔ آپ بیتی کسی حد تک عہدِ حاضر کی عکاسی کا سب سے مستند اور براہِ راست ذریعہ سمجھی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں مصنف اپنے ذاتی حالات کے ساتھ اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی مناظر کو بھی پیش کرتا ہے۔

بقول ملیحہ وزیر حسین:

"آپ بقی محض ایک شخص کی آپ بیتی نہیں ہوتی بلکہ اس شخص کے عہد کے حالات، اہم واقعات کی ایک مختصر تاریخ ہوتی ہے۔" (۲)

در حقیقت کوئی بھی ادیب جب اپنی آپ بیتی لکھتا ہے تو وہ صرف اپنی ذات کی کہانی نہیں لکھتا، بلکہ اپنے زمانے کی اجتماعی کہانی بھی سناتا ہے۔ وہ اپنے تجربات کے پس منظر میں پورے عہد کے سیاسی اتار چڑھاؤ، سماجی رویوں، معاشی صورت حال اور فکری تحریکوں کی جھلک دکھاتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے زمانے کے ادبی منظر نامے کو بھی قلم بند کرتا ہے یعنی اس دور کے مشاعروں، ادبی محفلوں، حلقہ ہائے احباب، تخلیقی میلانات، اور ادبی موضوعات کی نوعیت کو بھی بیان کرنا ہے۔ یہ تمام عناصر اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس عہد میں ادب کا رجحان کیا تھا، تخلیقی اظہار کے لیے کون سے موضوعات نمایاں تھے، اور ادبی مجالس کا فکری معیار کیسا تھا۔

اسی تناظر میں جب ہم "یادوں کی برات" از جوش ملیح آبادی اور "یادوں کا جشن" از کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ دونوں خود نوشتیں اپنے عہد کے صرف سیاسی و سماجی حالات کی نہیں بلکہ اس کے ادبی ماحول کی بھی آئینہ دار ہیں۔ ان میں جہاں سیاست، معاشرت، اور تہذیب کے نشیب و فراز بیان ہوئے ہیں، وہیں ان میں مشاعروں، علمی مجالس، اور ہم عصر شعرا و ادبا کے تذکرے بھی بڑی محبت، فخر اور فنی شعور کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ دونوں آپ بیتیاں دراصل اپنے اپنے دور کے ادبی منظر نامے کی زندہ تصویریں پیش کرتی ہیں، جنہیں پڑھ کر قاری نہ صرف اس زمانے کی ادبی فضا کو محسوس کرتا ہے بلکہ اس عہد کی فکری نبض کو بھی پہچان لیتا ہے۔

یادوں کا جشن میں پیش کردہ ادبی منظر نامے:

یادوں کا جشن مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی ہے جس میں ان کی زندگی کے متعلق قریب قریب ہر طرح کی معلومات شامل ہے جیسا کہ بچپن، تعلیم، مشاغل، کھیل، ملازمت، تقسیم بر صغیر اور اس ضمن میں پیش آنے والے واقعات کا ذکر ہے۔ مہندر سنگھ بیدی کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ملازمت کے لحاظ سے ان کا تعلق جن شعبوں سے رہا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر سیاست اور حکومت کے قریب تھے۔ جیسا کہ وہ مجسٹریٹ، سٹی مجسٹریٹ، ڈپٹی کمشنر، افسر مال، ڈپٹی ڈائریکٹر، میلہ ایڈمنسٹریٹر اور ڈائریکٹر پنچایت کے عہدوں پر فائز رہے۔ ایسے عہدوں سے تعلق رکھنے والے انسان کے بارے میں عمومی طور پر یہی خیال کیا

جاسکتا ہے کہ اس کا ادب سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہو گا مگر مہندر سنگھ بیدی کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ بلاشبہ وہ سیاسی شعبوں سے وابستہ رہے مگر ان کا اردو زبان سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اردو سے محبت کی وجہ ان کے استاد ہیں جن کا ذکر وہ آپ بیتی میں کرتے ہیں کہ تعلیمی اداروں میں ہر درجے پر ان کو اردو کے بہترین استاد ملے جنہوں نے ان کے ذوق کو وسعت بخشی۔ اردو سے بیدی کا تعلق واجبی سا نہیں تھا بلکہ وہ بیسویں صدی کے اردو کے اہم شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اردو سے محبت کے حوالے سے اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ

"مجھے اپنی شاعری پر ناز نہیں لیکن اس بات پر ضرور فخر کرتا ہوں کہ مجھے خداوند تعالیٰ نے اردو زبان کی خدمت کرنے کا موقعہ دیا اور توفیق بھی عطا فرمائی اور تادم آخر میری یہی کوشش رہے گی کہ میں اردو کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکوں۔ اردو زبان سے مجھے قدرتی لگاؤ ہے اور جب یہ کم توجہی تغافل سوتیلے پن اور تعصب کا شکار ہوتی ہے تو دل دکھتا ہے۔" (۳)

بیدی کی اردو سے یہ محبت صرف لفظی نہیں بلکہ انہوں نے اس کا ثبوت بھی دیا۔ ایک تو بطور شاعر ان کا اردو میں اہم حصہ ہے اور دوسری طرف انہوں نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد دہلی اردو اکادمی کی صدارت کا عہدہ سنبھالا اور اس کے علاوہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے نائب صدر رہے، غالب اکادمی کے مجلس انتظامیہ کے اہم رکن رہے ہیں اور بھارت میں حکومت کی طرف سے قائم کی جانے والی ترقی اردو بورڈ کے نائب صدر بھی رہے ہیں۔ ملازمت کے بعد کی زندگی کو انہوں نے اردو زبان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

مہندر سنگھ بیدی نے آپ بیتی میں بھارت میں اردو کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں انہوں نے ایک ایسے دور کی طرف نشاندہی کی ہے جب بھارت میں اردو کے متعلق شدید تعصبانہ رویہ رکھا جاتا تھا اور اردو کے حق میں جو تحریکیں چلی ہیں بیدی صاحب ان میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور اردو کی ترویج کے لیے ممکنہ حد تک تمام اقدامات کرتے رہے ہیں۔ جس طرح مشاعرے قائم کروانا اور شعراء کو مدعو کرنا اور اس قسم کی دوسری تقاریب منعقد کروانا ان کے کاموں میں شامل رہا جس کا وہ آپ بیتی میں بار بار ذکر کرتے ہیں۔ یہ تفصیل ان کے متعلق یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان کا اردو کی طرف کس طرح کا رویہ تھا اور وہ اس زبان کے لیے کس قدر سنجیدہ تھے کہ اردو زبان کو فروغ ملتا رہے اور اس کی جتنی خدمت ہو سکتی ہے کی جائے۔

مہندر سنگھ بیدی بیسیویں صدی کے اہم شعراء میں سے تھے اور ان کے سیاسی رہنماؤں کے علاوہ ادیبوں سے بھی گہرے تعلقات تھے۔ اس ضمن میں ان کی آپ بیتی میں ادب دوست لوگوں کا ذکر بہت زیادہ ملتا ہے۔ ادیبوں سے تعلقات اور ادب سے متعلقہ دوستوں کا ذکر ملتا ہے اس کے علاوہ ان کے دور میں ہونے والے مشاعروں اور چیدہ چیدہ ادبی محفلوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ایک انسان جس کی اردو سے والہانہ محبت ہو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی آپ بیتی میں اردو کا اور اردو سے متعلق محفلوں کا ذکر نہ ہو۔ مہندر سنگھ بیدی کا تعلق سیاسی شعبہ جات سے رہا ہے لیکن ان کے اردو ادب سے گہرے تعلق کی بنا پر ان کی خود نوشت میں سیاست، تقسیم ہند اور ملازمت کے علاوہ ادب کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جس میں ادبی محفلوں اور مشاعروں کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ غیر سیاسی گرمیوں کا ذکر ہے جن کا کہیں نہ کہیں ادب سے تعلق ہے۔

یادوں کا جشن میں ادبی منظر ناموں میں ادبی محفلوں، مشاعروں اور ادبی لطائف کا ذکر بھی ملتا ہے اس کے علاوہ شعراء اور صحافیوں کا بھی کہیں کہیں تذکرہ ملتا ہے۔ بیدی کی آپ بیتی میں ان کا آرٹ سے بھی تعلق کا ذکر ملتا ہے جس میں ان کا فلم انڈسٹری کے لوگوں سے گہرے یارانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ چونکہ مہندر سنگھ بیدی کا تعلق سیاسی شعبہ جات سے رہا ہے اور ان کی ذمہ داریاں بھی کچھ اس قسم کی رہی ہیں جیسا کہ ہندو مسلم فسادات کے دوران امن قائم کرنا اور لوگوں کو مشتعل ہونے سے بچانا۔ بنیادی طور پر اس بے ہنگم اور خون ریزی کے دور میں مہندر سنگھ بیدی کو امن قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی اور امن قائم کرنے کے دوران ان کو زیادہ تر موقعوں پر ادب بہت کام آیا۔ انھوں نے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے تقاریب منعقد کروائیں جن میں انھوں نے مشاعروں کا انعقاد کروایا، موسیقی اور ادب سے متعلقہ دوسری چیزوں کو ان تقاریب میں شامل کیا۔ ملکی حالات کو قابو کرنے کے لیے جو بھی سرگرمیاں رہی ہیں ان سب میں بیدی نے ادب کو اولین ترجیح پر رکھا ہے اور ادب میں بھی شاعری کو سرفہرست رکھا ہے۔ چونکہ بیدی ادبی لحاظ سے شاعر تھے تو تفریحی موقعوں پر شاعری کا اہتمام زیادہ کیا جاتا رہا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں ادبی لحاظ سے جو اولین ذکر ملتا ہے وہ امن قائم کرنے کے متعلق ہی ملتا ہے جس میں انھوں نے ہر جگہ ادب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ یہ وہ حالات تھے جب برصغیر کی اقوام آپس میں دست و گریباں تھیں۔ اس کے علاوہ جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو بیدی نے جشن جمہوریت کے لیے تقاریب منعقد کروائی جس میں انھوں نے شاعرے کروائے اور کئی دوسری سرگرمیاں بھی تفریح کے لیے اس میں شامل کی گئیں۔ اس جشن کے متعلق مالک رام ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ

"ہندوستان کا پہلا جشن جمہوریہ کا مشاعرہ انہیں کے زمانہ ملازمت میں منایا گیا۔ یہ تقریب لال قلعہ میں منعقد ہوئی۔ مشاعرہ میں وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو خود بنفس نفیس آخر تک رونق افروز ہوئے۔ اس پیمانے اور اس شان و شوکت سے یہ تقریب پھر نہیں منائی گئی۔" (۴)

بیدی کی آپ بیتی کے علاوہ ان کے دوست احباب بھی اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ انھوں نے اپنے معاملات میں اردو ادب کو کس طرح کام میں لایا ہے۔ بیدی نے اردو ادب کے ذریعے صرف اپنی زندگی اور اپنی ذات میں حظ نہیں اٹھایا بلکہ اس کو مختلف طریقوں سے دوسروں کے لیے بھی باعث تسکین بنایا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ بیدی کی آپ بیتی میں سیاست کے ساتھ ادب کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت میں ایک اور وصف نمایاں ہے جو عمومی طور پر نہیں نظر آتا۔ عمومی طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ سیاست اور حکومت کا ادیبوں سے اکثر و بیشتر جھگڑا رہا ہے لیکن بیدی بیک وقت سیاست اور ادب سے منسلک رہے ہیں اور دونوں پہلوؤں کو بہترین طریقے سے اپنی شخصیت میں مجتمع رکھا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں ادبی لحاظ سے جو تذکرہ ہے ان میں چند چیزیں بہت اہم ہیں جیسا کہ مشاعروں کا ذکر، شاعر دوست، شاعری، ادبی لطائف اور شاعروں کی معاصرانہ چشمک کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں دیکھیں تو ادبی لحاظ سے سب سے پہلے ان کی ذات کا ذکر آتا ہے کہ وہ نہ صرف اردو ادب سے محبت رکھتے تھے بلکہ ایک اہم شاعر بھی تھے۔ بیدی کو شاعر بنانے میں ان کا اپنا ذوق بھی شامل رہا ہے اور اس لحاظ سے ان کو اساتذہ بھی ایسے نصیب رہے جنھوں نے ان کے شعری ذوق کو پختہ کیا۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"ساہیوال سے چیفس کالج لاہور آیا تو وہاں دو مشفق استاد میسر ہوئے۔ ایک مولوی کرامت اللہ تھے دوسرے ہیڈ ماسٹر سید جلال الدین حیدر تھے جو شاعر بھی تھے۔ سید جلال الدین حیدر ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ مصرع طرح دے دیا کرتے تھے اور ہم سب لوگ طبع آزمائی کرتے تھے۔" (۵)

انسان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں اساتذہ کا کتنا اہم کردار ہوتا ہے۔ مصنف کی آپ بیتی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جتنے بھی تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی ہے وہاں ان کو ادبی لحاظ سے ہمیشہ اچھے مواقع حاصل رہے ہیں۔ یہ بات اس چیز کی بھی وضاحت کرتی ہے کہ اس دور میں بھی یعنی متحدہ ہندوستان میں تعلیمی اداروں میں انسانی شخصیت کے ایسے پہلوؤں پر بھی توجہ دی جاتی تھی جن کا تعلق غیر نصابی سرگرمیوں سے ہوتا تھا۔ اس کی نسبت آج کے دور میں دیکھا جائے تو تعلیمی اداروں میں طلباء کی

تخلیقی صلاحیت نکھرنے کے بجائے غائب ہو جاتی ہے کیونکہ نصابی سرگرمیوں پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے سو انسان کو تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لانے کا موقع ہی نہیں مل پاتا۔

اصل میں بیدی میں جو شعری ذوق موجود تھا اس کو ان کے اساتذہ نے تقویت بخشی جس کی وجہ سے آج ان کا شمار بیسیویں صدی کے اہم شعراء میں ہوتا ہے۔ یعنی مہندر سنگھ بیدی کو چیفس کالج لاہور میں شعر کے لیے طبع آزمائی کا سنہری موقع ملا جس سے انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ تعلیمی میدان میں شعر گوئی کے مواقع ملنے کے علاوہ بیدی کو بعد میں شاعری کے لیے کوئی موزوں حالات نہ مل سکے جس کا ذکر وہ خود اپنی آپ بیتی میں کرتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے کے بعد بیدی کو جو شاعری کے لیے انتہائی سازگار ماحول میسر آیا وہ ان کا ملازمت کا وہ دور ہے جب ان کی دہلی تعیناتی ہوئی۔ دہلی یوں بھی زمانہ قدیم سے اردو شاعری کا گہوارہ تھا اور بیدی کے وقت میں بھی دہلی کا نام اردو ادب کے لیے اہم تھا۔ ان کے ادبی ذوق کی اصل پرورش دہلی میں رہنے کی وجہ سے ہوئی۔ شعر گوئی کے ماحول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"صحیح معنوں میں میرے ذوق شاعری کو دہلی ہی میں سازگار فضا میسر ہوئی۔" (۶)

دہلی ہمیشہ سے ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے تاہم بیدی کو بھی وہی ماحول بہترین ملا جس کی نسبت سے ان کا ادبی محفلوں میں آنا جانا بڑھا اور وہاں زیادہ عرصہ قیام کی بنا پر ادبی حلقوں سے بھی ان کی آشنائی ہوئی جس کے بعد انھوں نے برابر شرکت کرنا شروع کی اور ادبی ذوق کو مزید پروان چڑھایا۔

"کنور مہندر سنگھ بیدی کا تعلق نہ صرف سیاسی حلقوں میں تھا بلکہ وہ شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ اور اس ذوق میں ان کے تعلقات کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں ہر فن کے ماہرین موجود تھے۔ شعرا میں ان کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد تھی اور سب سے اچھے تعلقات تھے۔" (۷)

بیدی کی زندگی کے مقصد کی طرح ان کی شاعری کی بنیاد بھی اتحاد و امن رہی ہے۔ ان کی شاعری میں عشقیہ شاعری سے زیادہ انسانیت و ہمدردی کا پیغام ہے۔ ان کی شاعر انسان اور اتحاد قائم کرنے کی طرف راغب کرتی ہے۔ ان کی شاعری کے اہم موضوعات میں اتحاد، ہمدردی اور انسانیت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ بیدی ایک نعت گو شاعر بھی ہیں۔ اہل بیت سے محبت کی بنا پر ان کے ہاں نعتیہ اشعار بھی ملتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مدینہ سے محبت میں بھی شاعری کی گئی ہے۔ فاروق ارگلی لکھتے ہیں کہ

"نور صاحب نے اسلامی تاریخ اور دینی علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ پیغمبر انسانیت ﷺ کی سیرت مقدسہ سے بے حد متاثر تھے۔ اپنے اس احساس کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لئے انھوں نے حضور اکرم ﷺ کی عقیدت و محبت میں متعدد نعتوں کی تخلیق کی۔" (۸)

اس طرح معلوم ہوا کہ بیدی ایک نعت گو شاعر بھی تھے اور ان کا بطور شاعر اردو دنیا میں اہم نام

ہے۔

ادبی لحاظ سے ان کی آپ بیتی میں ایک اہم موضوع ان کے مشاعرے بھی ہیں۔ مہندر سنگھ بیدی مشاعروں کی نظامت میں بہت اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں اسی وجہ سے انھوں نے آپ بیتی میں مشاعروں کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے آپ بیتی میں مشاعروں کے ماحول سے لے کر شعراء کے کلام تک ہر طرح کی قسم بیان کی ہے۔ حقیقی مشاعروں کا ماحول، مشاعرے میں آنے والے شعراء کی اقسام، شعراء کے کلام کی نوعیت ہر چیز کو واضح کیا ہے اس کے علاوہ بطور منتظم ایک مشاعرہ منعقد کروانے والے کو کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ایک انسان جو بطور سامع کسی مشاعرے میں جاتا ہے اس کا مشاہدہ ایک منتظم سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ ہر شاعر کے مزاج کا علم ہونا، شکایات کی نوعیت اور ایسی تمام باتوں کا علم ایک شخص کو بطور منتظم زیادہ اچھے سے ہوتا ہے۔ بیدی نے مشاعروں کی منظر نگاری اس طرح سے کی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاری بذات خود مشاعرے میں موجود ہے۔ مشاعرے کروانے والوں کی اقسام کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مشاعرے کے مقاصد کو بھی بہت اچھے سے واضح کیا گیا ہے کہ اس کے مقاصد کیا ہو سکتے ہیں اور شعراء کو مدعو کرنے کے طریقہ کار بھی بتائے گئے کہ باقاعدہ خط و کتابت کے ذریعے شعراء کو مشاعروں میں بلایا جاتا ہے۔ مشاعروں کے متعلق وضاحت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ہندوستان میں اردو زبان کو کہیں بھی علاقائی زبان تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے ہر علاقہ میں اس زبان کو سمجھنے والے اور اس کی قدر کرنے والے موجود ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ہندوستان کے کونے کونے میں اتنے اچھے مشاعرے ہوتے ہیں کہ کل ہند شہرت رکھنے والے شاعروں کے لیے ممکن ہی نہیں ہوتا کہ وہ ہر اچھے مشاعرہ میں شریک ہو سکیں۔" (۹)

اُس دور میں اردو ادب کی محفلوں کی کس قدر اہمیت تھی اور ایک وسیع سطح پر ادبی محفلیں منعقد کی جاتی تھیں اور لوگ ان میں بخوشی نہ صرف شریک ہوتے تھے بلکہ ایسی محفلوں کا انتظار کرتے تھے۔ ادبی

محفلیں تعداد میں بھی زیادہ منعقد ہوتی تھیں اور ان سب کے معیار بھی پائیدار تھے۔ ناظرین ان محفلوں سے اپنے لیے بہت کچھ سیکھ پاتے تھے، ان محفلوں کے ذریعے ایک ادبی ذوق رکھنے والے انسان کو اپنے ذوق کو بڑھانے کا موقع ملتا تھا اور کسی کے اندر اگر ذرا بھی اس ذوق کی نشان دہی ہوتی تو اس کے لیے مواقع مہیا کیے جاتے تاکہ ایسا انسان اپنی تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لاسکے۔ نئے لوگوں کا ان محفلوں اور مشاعروں کے ذریعے تعارف ہوتا تھا اور ان کی بے حد حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ جن مشاعروں کا ذکر مہندر سنگھ بیدی نے کیا ہے یہ بیسیویں صدی کا دور ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ادب کی کتنی قدر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ادبی محفلیں اتنی زیادہ اہم تھیں کہ کوئی محفل ایسی نہیں ہوتی تھی جو ادبی گفتگو یا مشاعرے کے بغیر ہو۔ بیدی کی آپ بیتی کے ان ادبی منظر ناموں سے اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ ادب صرف ایسی شے نہ تھی کہ اس کو فراغت میں استعمال میں لایا جائے بلکہ ہر جگہ اس کی اہمیت تھی اور کوئی محفل ادبی گفتگو کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اس دور کے ادیبوں اور شعراء کی آپ بیتوں میں ادب کا ذکر سرفہرست ہے۔ مشاعروں کے ذکر سے اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ صرف تفریح کا سامان نہیں تھے بلکہ بہت سارے نئے لوگوں کے لیے یہ سنہری مواقع ہوتے تھے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ

"مشاعروں سے بے شک ادب کی خدمت ہوتی ہے۔ اچھے شعراء کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔" (۱۰)

یہ مشاعرے عوام کی تفریح کے ساتھ ساتھ نئے تخلیق کاروں کے لیے اہم مواقع بھی ثابت ہوتے تھے۔ بیدی نے نہ صرف بھارت میں بلکہ پاکستان میں بھی مشاعرے منعقد کروائے ہیں اور پاکستان میں مشاعرے کروانا اور بھارت کے شعراء کو ساتھ لے کر آنا اور بھارت میں مشاعرے کروانا اور پاکستانی شعراء کو مدعو کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مہندر سنگھ بیدی دونوں ملکوں میں اتحاد کو فروغ دینا چاہتے تھے اور وہ دونوں ملکوں میں بھائی چارے کے خواہش مند تھے جس کے لیے انھوں نے اپنے طور کو شش بھی کی اور یہ مشاعرے اس کوشش کا ایک حصہ ہیں۔

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی میں ادبی طور پر ان کی شاعری اور مشاعروں کے ساتھ ان کے شاگردوں کا بھی ذکر ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مہندر سنگھ بیدی شاعری میں دوسروں کی اصلاح بھی کرتے تھے اس ضمن میں انھوں نے اپنی آپ بیتی میں دو شاگردوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے شاعری میں بیدی سے اصلاح لی ہے۔ ان شاگردوں میں ایک نام رعنا سحری اور دوسرا ساحل سحری کا ہے۔ یوں تو مہندر سنگھ بیدی نے خود شاعری کے لیے کسی استاد سے باقاعدہ اصلاح نہیں لی لیکن وہ ایک ایسے اچھے شاعر تھے تب

ہی ان کو اصلاح دینے کا مقام حاصل ہوا ہے کہ وہ نوجوان شعراء میں سے کچھ کے استاد رہے ہیں اور لوگوں نے ان سے شاعری کے معاملے میں اصلاح لی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ مہندر سنگھ بیدی کا اردو زبان اور اردو شعراء سے گہرا تعلق تھا۔

مہندر سنگھ بیدی نے اپنی آپ بیتی میں کافی دوست احباب کا ذکر کیا ہے جیسے، پنڈت ہری چند اختر، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پریم چند، مالک رام، کرشن لعل نارنگ ساقی، جمیل الدین عالی، فراق گورکھپوری ایسے لوگ ہیں جن کا براہ راست اردو ادب سے تعلق رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا اردو ادب سے مختلف طریقے کا تعلق رہا ہے کوئی صحافی، کوئی شاعر کوئی افسانہ نگار اور کچھ اردو کے محققین میں سے بھی ہیں۔ محمد شہاب بالخصوص جوش ملیح آبادی اور جگر مراد آبادی سے کنور صاحب کے مراسم کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"جوش ملیح آبادی اور جگر مراد آبادی جیسے مشہور شاعروں سے ان کے مراسم کی نوعیت ہی مختلف تھی۔ بیدی کا ان دونوں شاعروں کے ساتھ احترام و عقیدت کے علاوہ ہم پیالہ ہم نوالہ ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔" (۱۱)

مزید برآں انھوں نے جتنے بھی ادبی لوگوں کا ذکر کیا اس میں ان کے مزاج، تعلیم، پیشہ اور ذوق کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ جیسا کہ پنڈت ہری چند اختر کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ شاعر بھی تھے لیکن صحافت کے میدان میں زیادہ آگے تھے لیکن شاعری کے حوالے سے کم گو تھے اس کے علاوہ بیدی نے پنڈت ہر چند اختر کی اخلاقی صفات کا ذکر کیا ہے کہ وہ بطور انسان کس طرح کے شخص تھے۔ اسی طرح جوش ملیح آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ تھے تو اعلیٰ پائے کے شاعر مگر ان کی شخصیت ایسی تھی کہ گھنٹوں خاموش رہتے تھے اور شاعری کا ذکر، یا شاعری پر بحث بہت کم کرتے تھے اس کے علاوہ یہ بھی کہ جوش ملیح آبادی بطور مدیر بھی ادب سے منسلک رہے ہیں۔ اسی طرح بیدی نے قریب قریب ہر ایک دوست کا تعارف عام و خاص دونوں الفاظ میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ عنوان سے ہٹ کر بھی بیدی نے کچھ اہم لوگوں کا ذکر کیا ہے جیسا کہ حفیظ جالندھری کی شاعری کا ذکر ہے اور ان کے شعر پڑھنے کے خاص انداز کی بات کی گئی ہے۔ جس طرح وہ ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"لاہور شہر ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ علامہ اقبال زندہ و سلامت تھے۔ مولانا تاجور، عبد المجید سالک، حفیظ جالندھری، ایم ڈی گوہر، صوفی تبسم، مولانا ظفر علی اور سر عبد القادر کے دم قدم سے ادبی ماحول میں کافی سرگرمی تھی اور دلچسپی بھی۔" (۱۲)

ان احباب کے علاوہ بھی کئی اہم لوگوں کا ذکر ان کی آپ بیتی میں ملتا ہے جن کا تعلق سیاست سے بھی ہے لیکن یہ چند ایسے لوگ ہیں جن کا ذکر خاص اردو ادب کے حوالے سے ہوا ہے۔ ان چند ادبی دوستوں کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدی کے ہم عصر شاعر اور ادیب کون تھے۔ ان کی آپ بیتی میں جن لوگوں کا ذکر ہے اس کے مطالعے سے یہ وضاحت بھی ہوتی ہے کہ وہ دور اور لوگ ایسے تھے کہ ہر جگہ ادبی محفل کا موقع میسر آتا تھا اور اس کے علاوہ یہ بھی کہ مہندر سنگھ بیدی کو ادبی ماحول کے لیے کتنے اہم لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ان اہم لوگوں میں خاص ذکر علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری کا ہے۔ یہ بیدی کی طالب علمی کا زمانہ تھا اور اپنے دور کے نامور ناموں کو انھوں نے اپنے سامنے دیکھا اور ان کی محفلوں میں شرکت کرنے کا موقع بھی حاصل رہا۔ انہیں صحبتوں کی بنا پر مہندر سنگھ بیدی نے ادب میں اپنا مقام بنایا۔ ان محفلوں کے ذکر سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ ایک انسان کے اندر اگر ادبی ذوق ہے تو اس کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے صحبت کا ہونا کتنا زیادہ ضروری ہے۔

صحبت اور ماحول کسی بھی شوق کے لیے بہت ضروری ہیں اس کے بارے میں بیدی نے خود اپنا تجربہ بھی بیان کیا ہے جس میں وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کو ادبی ذوق کے لیے طالب علمی کے زمانے کے بہت عرصے بعد جو فضا میسر آئی وہ دہلی کی فضا تھی جہاں ان کے شعری ذوق کو پنپنے کا موقع ملا، اس سے یہ چیز سمجھ آتی ہے کہ کسی بھی کام کو کرنے کے لیے ماحول کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مہندر سنگھ بیدی نے اپنی آپ بیتی میں ادیبوں کی حریفانہ چپقلش کا بھی ذکر کیا ہے اور شعراء کی معاصرانہ چشمک کو بھی واضح کیا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ ایک ہی جگہ پر، ایک ہی شعبے میں رہنے والوں کو، کام کرنے والوں کو آپس میں اختلاف رہتا ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی ہو اس کو ایسے اختلافات کا سامنا کرنا ہوتا ہے لیکن جب ادب میں اختلاف کی بات آتی ہے تو اس کو معاصرانہ چشمک کا نام دے کر ایک اہم تعلق کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آپس کا اختلاف ہونے سے مراد صرف یہ نہیں ہوتا کہ انسان آپس میں دست و گریباں رہیں بلکہ اختلاف اگر علمی لحاظ سے ہو تو وہ علم کا حسن بن جاتا ہے۔ علمی اختلاف، نظریاتی اختلاف ایسی چیزیں ہیں جو علمی بحث کو دعوت دیتی ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اختلاف کی بنیاد ذاتی نوعیت کی نہیں ہونی چاہیے بلکہ علمی اور نظریاتی ہونی چاہیے جو کہ مزید مثبت معلومات کا پیشہ خیمہ ہو سکتی ہے۔

اس ضمن میں بیدی نے صحافت کے میدان میں جس ادبی اختلاف کا ذکر کیا اس میں اخبار نویسوں کا ذکر اہم ہے۔ اس بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"اخبار نویسوں میں حریفانہ چپقلش بھی اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ اس میدان میں مولانا ظفر علی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن پنڈت ہر چند اختر بھی اس میدان کے شہسوار تھے۔ نانک چند نار اور کچھ دیگر صحافی بھی اس ادبی رزم میں شریک ہوتے تھے۔ سر عبدالقادر ایک صلح کل انسان تھے وہ اکثر و بیشتر اس جنگ کو ختم کرانے کی کوشش کرتے تھے۔" (۱۳)

ادب میں یہ حریفانہ چپقلش خوبصورتی کا درجہ رکھتی ہے۔ اختلاف اگر ذاتی نوعیت کا نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مہندر سنگھ بیدی نے شاعروں کی معاصرانہ چپقلش کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں انھوں نے ظریف دہلوی اور سید محمد جعفری کو عنوان بنایا ہے۔ یہ دونوں مزاحیہ شاعر تھے اور ان کے شاعری کے رنگ بھی الگ تھے لیکن اس کے باوجود دونوں میں ان بن لگی رہتی۔ اس ضمن میں بیدی نے ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس میں دعوت کلام کے لیے بیدی نے سید محمد جعفری کو بلایا اور ظریف دہلوی کی نسبت ان کے کلام کی تعریف میں کچھ زیادہ الفاظ بول دیے جس کی وجہ سے بعد میں ظریف دہلوی نے ان سے ناراضی کا اظہار کیا اور آخر کار بیدی کو ان سے معذرت کرنا پڑی۔ اس حوالے سے مہندر سنگھ بیدی لکھتے ہیں کہ "یوں تو ہر دور میں ہر ملک میں شاعروں میں آپس میں رقابت اور چپقلش رہی ہے لیکن اردو شاعروں میں ایسا مرض کافی نقصان دہ ثابت ہوتا رہا ہے۔ میر و سودا، آتش و ناسخ، غالب و ذوق، جگر و فراق، جوش و حفیظ جالندھری بھی اس دیرینہ "روایت" کے علمبردار رہے ہیں۔ دہلی میں بھی یہی عالم تھا۔ بیخود اور سائل صاحب بھی اس سے نہ بچ سکے حالانکہ ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ ظریف دہلوی مزاحیہ شاعر تھے اور اپنے خاص رنگ میں خوب کہتے تھے۔۔ جس طرح شاعری کی الگ الگ اصناف ہیں اسی طرح مزاح اور طنز میں بھی مختلف رنگ ہیں۔ ظریف و جعفری کا رنگ الگ الگ تھا۔" (۱۴)

اگرچہ شاعروں کے کلام کا رنگ مختلف ہو لیکن اگر وہ ہم عصر ہیں تو اختلافی مسائل رہتے ہیں۔ معاصرانہ چشمک اردو شاعری کی روایت میں ہے جو کہ اب تک چلی آرہی ہے اور جب بھی اردو شاعری اور شعراء کا ذکر ہوتا ہے ان کے ساتھ شعراء کی چپقلش کا ذکر لازمی آتا ہے۔

مہندر سنگھ بیدی نے مزاح کی ادبی صنف پر بھی قلم فرسائی کی ہے۔ جس میں انھوں نے اس بات کا ذکر کیا کہ اردو ادب میں انسان کو تب تک نہیں تسلیم کیا جاتا جب تک ایک شخص مزاح کار نہ ہو۔ اس سلسلے میں بیدی نے مزاح نگاروں کی اقسام کا ذکر کیا ہے کہ کیسے مزاح نگار اردو ادب میں پائے جاتے ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے انھوں نے اپنی آپ بیتی میں جو ذکر کیا ہے اس کو "لکھنا مزاحیہ مضمون" کا نام دیا ہے۔ ان کے اس بارے میں جو خیالات ہیں اس میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک

مزاح نگاروں میں ایک چیز عام ہے کہ ان کے ہاں ہمیشہ کسی نہ کسی کا مزاق اڑانا مقصود رہتا ہے۔ اس رائے کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں:

"کیوں نہ ہم بھی آج ہی ایک مزاحیہ مضمون لکھ ماریں۔ خیر اس فیصلے کی حد تک تو کوئی غیر متوقع رکاوٹ پیش آنے کی امید نہ تھی لیکن جب ذرا سنجیدگی سے غور کیا تو گاڑی رک گئی کہ آخر کس کی بھد اڑائیں۔ ہمیں تو سبھی بھلے چنگے لوگ نظر آتے ہیں۔ خواہ مخواہ کیوں کسی کی پگڑی اچھالی جائے۔" (۱۵)

بیدی مزاح نگاروں کے متعلق یہ عمومی رائے رکھتے ہیں کہ ان کا کہیں نہ کہیں یہ مقصد ہوتا ہے کہ کسی کا مزاق اڑایا جائے۔ اس ضمن میں بیدی نے مزاح نگاروں کی مختلف اقسام بھی بیان کی ہیں اور ان کے مقاصد اور ان کے معیار کو بھی واضح کیا ہے۔ مزاح نگاروں کی انھوں نے جو اقسام بتائی ہیں وہ، ساختہ، خود ساختہ، حواس باختہ، سزایافتہ، برافروختہ، فروختہ مزاح نگار ہیں۔ ان کی بھی آگے مصنف نے خصوصیات بیان کی ہیں۔ جیسا کہ ساختہ مزاح نگار وہ ہیں جو اصل معنوں میں ادبی لحاظ سے مزاح نگار ہیں اور ان کا مقصد کہیں نہ کہیں معاشرے کی اصلاح ہے، خود ساختہ مزاح نگاروں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حکام بالا کے ہاں صرف ان کی خوشامد کرنے کو اپنا اولین مقصد گردانتے ہیں، حواس باختہ مزاح نگاروں کی قسم میں ایسے مزاح نگار آتے ہیں کہ جو الفاظ کے چناؤ اور انسانی ذات کی ذرا بھر پرواہ نہیں کرتے جیسے تیسے لکھ لیتے ہیں۔ اس طرح تمام اقسام کی خصوصیات کو بیدی نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام مزاح نگاروں کی اقسام میں سے صرف ایک ہی قسم ایسی ہے جو ادب کے معنوں میں مزاح نگاری کی فہرست میں آتی ہے اور وہ ساختہ مزاح نگاروں کی قسم ہے۔ جس کے بارے میں بیدی نے لکھا ہے کہ

"ساختہ مزاح نگار وہ ہوتے ہیں جنہیں بزلہ سنجی اور طنز و مزاح کاتب تقدیر کی جانب سے ودیعت ہوتی ہے۔ ان کا دماغ اور قلم سادہ سے سادہ مضمون میں بھی رنگینیاں، رعنائیاں اور دلچسپیاں بھر دیتا ہے اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات یا نکتہ جو انھوں نے نکالا ہے آج تک کسی کے علم میں تھا ہی نہیں۔ اگر یہ اصلاحی رویہ اختیار کر لیں تو سماج، ملک اور قوم کی خدمت کر سکتے ہیں۔" (۱۶)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مزاح نگاروں کا طبقہ ایسا ہے کہ وہ بھی ملک و قوم کی اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اگر اپنی مزاح نگاری کو ادب کے لحاظ سے صحیح معنوں میں استعمال کریں۔ مزاح نگار اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں اور مزاح نگاروں میں اصلاحی پہلو کے لحاظ سے بیدی نے اکبر الہ آبادی کا

ذکر کیا ہے کہ وہ ایسے مزاح نگار تھے کہ جو اصلاحی مقصد رکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مزاح نگار بعض اوقات معاشرے کی ایسی سچائیوں کو سامنے لاتے ہیں جن پر عمومی طور پر کسی کی نگاہ نہیں ہوتی۔ یہی مزاح نگار اگر انسانیت کی اصلاح کے بجائے انسانیت کا مذاق اڑانا اپنا مقصد بنا لیتے ہیں تو معاملات ذاتی نوعیت تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں واصف حسین لکھتے ہیں:

"مزاح ایسے عمل کو کہتے ہیں، جس کے ذریعے دوسروں کے ساتھ مل کر خوش طبعی حاصل ہو سکے۔ اس طرح کہ اس عمل سے کسی دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اور اگر وہ خوش طبعی کسی کے لیے باعث تکلیف ہو جائے، تو اسے مزاح نہیں؛ بلکہ سخریہ یعنی مذاق اڑانا کہیں گے۔" (۱۷)

مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی میں ادبی تذکروں میں ایک اہم موضوع ادبی لطائف کا بھی ہے جس میں انھوں نے اپنے احباب کے ساتھ گزارے گئے لمحات میں ہونے والے لطائف کا ذکر کیا ہے اور اس موضوع کو اپنی آپ بیتی میں الگ جگہ دی ہے۔ یوں تو دیکھا جاتا ہے کہ لطیفے سننا سنانا ہر ماحول کا حصہ ہوتا ہے، جیسا کہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب معمول کے مطابق اردو ادب میں تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس کی نوعیت خاص ہو جاتی ہے اسی طرح معمول کے لطیفوں میں اور ادیبوں کے درمیان گفتگو کے دوران بیان کیے گئے لطیفوں میں خاصا فرق ہوتا ہے جس کی بنیاد پر ادب ان کو خصوصی طور پر بیان کرتا ہے۔ بیدی کے بقول انھوں نے پچاس برس مشاعروں کی نظامت سنبھالی اور انھوں نے ہمیشہ مشاعرے کو اکتاہٹ سے بچانے کے لیے اپنی طرز میں مختلف لطیفے سنائے جو حاضرین کو متوجہ رکھنے میں کافی مؤثر ثابت ہوئے۔ بیدی ادبی لطائف کی ابتداء میں لکھتے ہیں:

"پچاس برس کے مشاعروں میں سیکڑوں دفعہ مشاعرہ کی نظامت اور صدارت کرنا پڑی اور برسر مشاعرہ سیکڑوں ایسے فقرے ہوئے جنہیں ادبی لطیفے کہا جاسکتا ہے لیکن افسوس کہ انھیں نوٹ نہ کیا جاسکا ورنہ اس ضمن میں ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی تھی۔" (۱۸)

بیدی کی آپ بیتی میں ادبی لطائف کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام زندگی کے لطائف اور ادبی لطائف میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ ادبی لطائف اور روزمرہ کے لطائف کی نوعیت اور زبان دونوں میں فرق ہے۔ اس کے علاوہ موقع کی مناسبت سے لطیفہ سنایا گیا ہے۔ مشاعرے میں اگر کوئی ایسا ماحول ہے تو اس کی نوعیت عین مشاعرے کے حساب سے ہے یا کسی شاعر کے کلام کو موضوع بنا کر اس کو داد دینے کے عمل میں لطیفہ سنا دیا گیا۔ ادبی لطائف کے لیے الفاظ کے چناؤ میں خیال رکھا گیا ہے۔ اس طرح روزمرہ کے اور ادبی

لطائف میں فرق آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ بیدی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ایک بار بمبئی کے مشاعرہ میں جوش ملیح آبادی اپنی تہلکہ مچا دینے والی نظم "گل بدنی" سنارہے تھے۔ بے پناہ داد مل رہی تھی۔ جب انھوں نے اس نظم کا ایک بہت ہی اچھا بند سنایا تو میں نے والہانہ داد دی اور کہا کہ "حضرات ملاحظہ ہو ایک پٹھان اتنی اچھی نظم سنارہا ہے۔" اس پر جوش صاحب بولے کہ "حضرات یہ بھی ملاحظہ ہو کہ ایک سکھ اتنی اچھی داد دے رہا ہے۔" (۱۹)

اس طرح ان کی آپ بیتی میں مختلف طریقوں سے لطائف کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور ادبی لطائف کے ضمن میں الگ سے عنوان کے ساتھ لطائف بھی بیان کیے گئے ہیں۔ جس سے یہ سمجھنے میں بھی آسانی ہوئی ہے کہ خالص ادبی محفلوں میں سنائے جانے والے لطائف اور عام لطائف میں کیا فرق ہے۔ ان کی زبان، ان کے الفاظ کے چناؤ اور موقع کی مناسبت میں بھی فرق ہے۔ اس کے علاوہ ادیبوں اور شعرا کی مزاق میں کی جانے والی باتیں خود بخود لطائف کا حصہ بن جاتی ہیں عام زندگی میں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ ان موضوعات کو آپ بیتی میں بیان کرنے سے یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ خالص ادبی محفلیں اور ان میں ہونے والی باتیں کیسی ہیں ان کے مزاح بھی ادب کے حساب سے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مہندر سنگھ بیدی نے آپ بیتی میں اپنا فلمی دنیا سے بھی تعلق بیان کیا ہے۔ فلمی دنیا، ہندوستانی و پاکستانی اداکاروں کے ساتھ تعلق کو موضوع بحث بنایا ہے جس سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ انھوں نے اس شعبہ میں بھی کام کیا ہے اور یہاں بھی ان کے تعلقات بہت اہم رہے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے دور کے اہم پاکستانی اور ہندوستانی اداکاروں کے بارے میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجموعی طور پر فلمی دنیا کے متعلق رائے بھی دی ہے۔ چونکہ وہ فلمی دنیا سے منسلک رہے ہیں اس کے ماحول میں ایک وقت گزارا ہے اس لحاظ سے بھی انھوں نے چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے فلمی دنیا میں جو کام کیے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ فلمی دنیا کے متعلق رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فلم سازی سے تعلق رکھنے والوں کی واقعی الگ دنیا ہے۔ اس میں دولت بے شمار ہے مگر انسانی قدروں کا فقدان ہے لیکن اس دنیا میں سبھی اس طرح کے نہیں۔ ان میں کہیں کہیں مخلص اور نیک انسان بھی ملتے ہیں۔ عام طور پر یہاں مطلب پرستی، خوشامدی، ابن الوقت، خود غرض لوگوں کی اکثریت ہے۔ ویسے تو میری شناسائی ان لوگوں سے تیس یا پینتیس برس سے ہے مگر ان کو زیادہ نزدیک سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب میں اور میرے بھائی فلم سازی کے میدان میں اترے۔" (۲۰)

مہندر سنگھ بیدی نہ صرف فلمی دنیا سے واقف تھے بلکہ انھوں نے باقاعدہ فلمیں بنانے کا بھی کام کیا ہے۔ انھوں نے پانچ فلمیں بنائیں جن میں سے تین پنجابی زبان میں اور دو اردو زبان میں تھیں۔ فلم سازی سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوا لیکن ان کی شناسائی فلمی دنیا میں کافی زیادہ ہوئی۔ ان کی فلموں میں 'دکھ بھجن تیرا نام'، 'من جیتے جگ جیتے، پاپی ترے نیک، چرن داس اور پیاسی آنکھیں شامل ہیں۔ فلمی دنیا سے تعلق کی بنیاد پر ان کے فلمی اداکاروں سے بھی اچھے مراسم رہے ہیں۔ دلپ کمار، سنیل دت، اوم پرکاش اور نرگس سے اچھے تعلقات رہے ہیں اور ان سب کو بیدی اپنے احباب کی فہرست میں رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاکستانی فلمی اداکار محمد علی سے بھی تعلق رہا ہے۔

مہندر سنگھ بیدی سحر کا ادب کی دنیا سے بہت گہرا تعلق رہا ہے اور پھر فلم سازی سے بھی منسلک رہے ہیں۔ وہ نہ صرف ادب کی دنیا سے بطور شاعر منسلک رہے ہیں بلکہ انھوں نے اردو ادب کے لیے خدمات بھی سرانجام دی ہیں۔ اردو کی ترویج کے لیے کام کرنا، اردو کے متعلقہ اداروں سے وابستہ رہنا اور مشاعرے منعقد کروانے میں ان کا نام اہم ہے۔ بیدی کا اردو دنیا سے تعلق کا مطالعہ کر کے علم ہوتا ہے کہ مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت کیسی تھی اور وہ کس طرح مختلف شعبوں سے منسلک رہے ہیں۔ اس کے ذریعے ان کی شخصیت کی مزید پرتوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ ایک ایسا انسان جو مہندر سنگھ بیدی کو صرف بطور سیاست دان جانتا ہے وہ اس آپ بیتی سے بیدی کی مختلف چیزوں کو سمجھ سکتا ہے۔

یادوں کی برات میں پیش کردہ ادبی منظر نامے:

جوش ملیح آبادی کو ادب میں بطور شاعر اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں آزادی و غلامی کے موضوعات ملتے ہیں اور اس کے علاوہ عشق بھی ان کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ جوش ملیح آبادی کی فطرت میں بغاوت تھی اور یہی عنصر ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ متحدہ ہندوستان کے دوران انھوں نے انگریز کے خلاف کئی نظمیں لکھیں۔ خاص طور پر جنگ عظیم دوم میں جب برطانیہ نے ہندوستانیوں سے مدد چاہی اور سرکاری ملازموں کو یہ کہا گیا کہ ہندوستانیوں سے جنگ میں برطانیہ کے حق میں بات کروائی جائے۔ اس دوران جوش ملیح آبادی نے "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" کے نام سے نظم لکھی جس میں انھوں نے براہ راست انگریزوں کو مخاطب کیا ہے اور یہ نظم انگریز کے خلاف لکھی جس کے بعد جوش ملیح آبادی پر کڑی نگاہ رکھی جانے لگی۔ ان کی شاعری کا انداز ہمیشہ سے ایسا رہا ہے اور اسی بدولت ان کو شاعر انقلاب کا خطاب دیا گیا ہے۔ اردو ادب میں ان کا مقام اور ان کی شہرت شاعری کی وجہ سے ہے۔ نثر نگاری

میں ان کے ہاں سب سے اہم جو تصنیف ہے وہ ان کی یادوں کی برات ہے۔ اس کے علاوہ مقالات، ادارے اور مضامین بھی نثر نگاری میں شامل ہیں مگر اس ضمن میں یادوں کی برات سرفہرست ہے۔

جوش ملیح آبادی چونکہ شاعر تھے اس وجہ سے ان کی آپ بیتی میں ادبی لحاظ سے زیادہ ذکر شاعروں، شاعری اور مشاعروں کا ملتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی آپ بیتی کا مطالعہ کریں تو سرفہرست شاعری کے حوالے سے نظریات آتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی شاعری کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اس کو سرپرست اور استاد کی حد تک اہم سمجھتے تھے۔ ان کا شاعری کے حوالے سے نظریہ بھی اسی قسم کا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو صرف ایک فن یا ادب کا حصہ نہیں سمجھتے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو کسی بزرگ کی سی حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعر بننا اور شاعری کے فن میں ماہر ہونا انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ شعر گوئی کسی کو خواہش کرنے پر نہیں مل سکتی بلکہ شاعری ایک ایسا فن ہے جو کہ اپنی مرضی سے شاعر بنوا دیتا ہے۔ شاعری کے ضمن میں ان کے نزدیک کوئی تمنا کر کے شاعر نہیں بنے گا بلکہ شاعری جس سے چاہتی ہے خود کو کھلوا دیتی ہے۔ اسی تناظر میں وہ خود کو شاعری کے شاگرد کے طور پر لیتے ہیں۔ نظریاتی طور پر دیکھیں تو یہ سمجھ آتی ہے کہ جوش ملیح آبادی نے خود کو مکمل طور پر شاعری کے حوالے کر رکھا ہے۔ اس کی تائید نیچے دیے گئے اقتباس سے ہوگی۔ لکھتے ہیں کہ

"میں شاعری کے پیچھے نہیں دوڑا، شاعری نے خود میرا تعاقب کیا اور نو برس کی عمر ہی میں مجھ کو پکڑ لیا۔ اگر شاعری کوئی اچھی شے ہے تو واللہ میں کسی آفرین کا مستحق نہیں ہوں اور وہ اگر کوئی بری چیز ہے تو خدا کی قسم میں کسی ملامت کا بھی سزاوار نہیں۔ شاعری میری حاکم ہے، میں محکوم۔ وہ جابر ہے، میں مجبور، وہ قاہر ہے، میں مقہور، وہ آمر ہے اور میں مامور۔" (۲۱)

درج بالا اقتباس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ جوش ملیح آبادی شاعری کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کے علاوہ شاعری میں جو نظریات ہیں کہ شعر گوئی آمد کا نتیجہ ہے یا آورد کا تو اس ضمن میں جوش آمد کے قائل ہیں اور جو لوگ اس نظریے کے قائل ہیں کہ اصل شعر وہی ہو گا جو ارادی طور پر کہا جائے تو ایسے نظریے کے وہ قائل نہیں یعنی کچھ لوگوں کے نزدیک اصل و مناسب شعر وہی ہو سکتا ہے جو بالقصد کہا گیا ہو مگر جوش ملیح آبادی اس نظریے سے مکمل طور پر اختلاف کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ شاعری کے متعلق جس چیز کا اظہار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان شعر کہتا ہے تو ایک شاعر کو کبھی بھی خود کو بڑا شاعر نہیں کہنا چاہیے۔ شاعری کے علاوہ بھی اگر اس نظریے کو دیکھیں تو عام زندگی میں بھی ایک شخص اگر

خود کو عقل کل تسلیم کرنا شروع کر دے تو اس کے سیکھنے کا عمل مختصر ہو جاتا ہے۔ ایسا کوئی بھی انسان جو یہ سمجھنا شروع کر دے کہ میں سب جانتا ہوں اس کے سیکھنے کا عمل کم ہو جاتا ہے۔ اسی زمرے میں جوش نے اس چیز کا تذکرہ کیا ہے کہ ایک شاعر کو کبھی خود کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں اور میں بہت ہی اعلیٰ شاعری کرتا ہوں اور اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر ہی میں ہوں۔ ممکن ہے اس سے جوش کی مراد یہ ہو کہ شاعری کی انتہا کو پہنچنے کے لیے اور ایک اچھا شاعر کہلانے میں یہ عمل رکاوٹ کا باعث بنے اس کی شاعری میں بہتری نہیں آ سکے گی اور نہ ہی ایسا شاعر کسی سے اصلاح لینے کی کوشش کرے گا۔ جو خود کو اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرنے لگے گا وہ یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی اصلاح کی جائے اسی ضمن میں جوش نے بطور شاعر اس عمل سے گریز کرنے کو کہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں ایک شاعر ہمیشہ سیکھنے کے عمل میں رہے اور ایسے کوئی بھی رائے اپنے لیے نہ قائم کرے جو اس کو اس خط میں مبتلا کر دے کہ اس زمانے میں میرے سے بڑھ کر کوئی شاعر ہی نہیں ہے۔ جوش ملیح آبادی شاعری کے میدان میں آنے والے لوگوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اپنی شاعری پر توجہ دیے رکھنی ہے۔ خود کو اس زعم میں نہیں ڈالنا کہ میں بڑا شاعر ہوں اور زمانہ مجھے تسلیم کرے۔ یعنی اگر انسان چاہتا ہے کہ اس کو اہمیت دی جائے اور اس کا نام بڑا ہو تو وہ اپنے کام پر توجہ دے۔ ایک وقت آئے گا کہ زمانہ خود اعتراف کرے گا کہ ایسے انسان کو مقام ملنا چاہیے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ

"ذہن انسانی میں عمل ارتقا برابر جاری ہے، آپ کی موت کے ڈیڑھ سو برس کے بعد نقادان ادب کا ذہن اس سطح پر آ جائے گا کہ وہ آپ کے متعلق فیصلہ کر سکیں۔ اس لیے سردست دانش مندی یہی ہے کہ آپ گوگو میں رہیں عقل کا مشورہ باون تولے، پاورتی کا ہے، اس کی معقولیت میں شبہ کرنا حماقت ہے۔" (۲۲)

شاعری کے نظریے میں ان کے نزدیک انسان اچھا شاعر بن نہیں سکتا جب تک کہ وہ عشق کے تجربے سے نہ گزرے۔ وہ عشق کو شاعری کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں اور اپنے بارے میں بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو عشق نے ہی آدمی بنایا ہے۔ اس کا اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

"ماہ رنوں کی ناشکری اور سلونیوں کی نمک حرامی ہوگی اگر میں اس بات کا اعتراف نہ کروں کہ ان کے عشق کے بغیر میں آدمی بن نہیں سکتا تھا۔ میرا تمام کلام اور بالخصوص جمالیاتی شاعری کی کج کلاہی انھیں متوالیوں اور بدھ ماتوں کی جوتیوں کا تصدق ہے۔" (۲۳)

جوش ملیح آبادی عشق کو صرف تفریح کا باعث نہیں سمجھتے بلکہ شاعری کے لیے اس کو اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی بجا طور پر اردو ادب میں ایک اہم شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو شاعری کی ابتدا میں کیا رکاوٹیں پیش آئی ہیں انھوں نے آپ بیتی میں اس کے متعلق بھی بیان کیا ہے۔ ان کے بقول انھوں نے نو سال کی عمر میں شاعری کرنا شروع کر دی تھی اور ان کو ان معاملات میں جن لوگوں کی طرف سے رکاوٹوں کا سامنا رہا اس پر بھی انھوں نے بات کی ہے۔ ہر چند کہ ان کے خاندان میں جو بھی بزرگ تھے قریب قریب سب ہی شاعر تھے پھر بھی اس فن کو اپنانے میں اور اس کے لیے وقت لگانے میں ان کو مشکل پیش آئی۔ ان کے والد صاحب یوں بھی بہت سخت مزاج انسان تھے۔ وہ اپنے والد کی اجازت کے بغیر ایک گھر سے دوسرے گھر بھی نہیں جاتے تھے۔ جوش ملیح آبادی کا ذوق شاعری میں تھا لیکن ان کو گھر سے والد صاحب کی طرف سے اس کی اجازت نہیں تھی۔ شعر گوئی کی اجازت کے عنوان میں جوش ملیح آبادی اس چیز کا ذکر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ

"جب شاعری سے میرا انہماک بڑھنے لگا تو شاید اس خیال سے کہ اگر میں شاعری میں ڈوب گیا تو میری تعلیم ناقص رہ جائے گی، میرے باپ کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور انھوں نے مجھے ارشاد فرمایا کہ خبردار، اب اگر تم نے شاعری کی تو، مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" (۲۴)

جوش ملیح آبادی کے والد نے جوش کو شاعری کرنے سے سختی سے منع کیا کیونکہ ان کو یہ فکر لاحق تھی تعلیم کا حرج نہ ہو اور شاعری کرنے والے ذہن شاعری سے زیادہ کسی چیز پر توجہ نہیں دیتے ساتھ ہی جوش ملیح آبادی کم عمری میں تھے اسی وجہ سے ان کے والد کو خطرہ تھا کہ تعلیم کی طرف سے روگردانی نہ ہو جائے۔ جوش ملیح آبادی کی شعر گوئی کی داستاں خاصی طویل ہے کہ انھوں نے اس قدر ممانعت کے باوجود شاعری ترک نہ کی اور آگے چل کر ان کے والد نے ان کو نہ صرف شاعری کی اجازت دے دی بلکہ ان کو ساتھ مشاعروں میں لے کر جانے لگے۔

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی میں ادبی تذکروں میں سب سے اہم ذکر شاعری اور مشاعروں کا ہے۔ شاعری کا ذکر ان کی ذات کے متعلق کہ انھوں نے کیسے شاعری کا آغاز کیا۔ ان کے شعری ذوق میں ان کی اپنی دلچسپی بھی تھی اور یہ فن ان کو خاندان کی طرف سے بھی ملا تھا۔ ان کے والد، دادا، ماموں، دادی اور کئی دوسرے بزرگ بھی شاعری میں مہارت رکھتے تھے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی شاعری کے سلسلے میں باقاعدہ طور پر کسی استاد کا ذکر نہیں کیا کہ انھوں نے کس سے اصلاح لی۔ ابتدائی عرصے میں انھوں نے عزیز لکھنوی سے اصلاح لینا شروع کی لیکن بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ عزیز لکھنوی اپنے

زمانے کے حساب سے شاعری کو دیکھتے تھے اور جوش ملیح آبادی اس دور کے مطابق نئی ذہنیت کے مالک تھے اس وجہ سے ان کی اصلاح کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنی آپ بیتی میں علامہ اقبال کا ذکر کیا ہے کہ جب جوش ملیح آبادی کا سب سے پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا تو باقی تبصرہ کرنے والوں کی فہرست میں علامہ اقبال کا نام بھی تھا۔

جوش ملیح آبادی کے سب سے پہلے شعری مجموعہ کا نام "روح ادب" ہے جو کہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کا موضوع تصوف تھا اور اسی مجموعہ پر علامہ اقبال نے ان کو داد بھی دی اور ساتھ ہی شاعری کے حوالے سے نصیحت بھی کی۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری کا رخ اس وقت تصوف کی جانب تھا اور علامہ اقبال نے شاعری کے حوالے سے جوش کو نصیحت کی کہ وہ اپنی شعری فکر کا رخ بدلیں اور عوام کو بیداری کی طرف لے جانے والی شاعری کریں۔ اس مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جوش اور اقبال ہم عصر تھے۔ دوسری چیز یہ واضح ہوتی ہے کہ ادب کی اتنی زیادہ اہمیت تھی کہ اس معاملے میں کسی سے اصلاح لینی ہوتی تو خطوط کے ذریعے بھی استاد شاگرد کا تعلق قائم رہتا اور آپس میں تعلق بحال رکھنے کے علاوہ خطوط کا مقصد ادبی اصلاح بھی تھی۔ کسی کتاب پر تبصرہ کرنا ہو، نئے ابھرتے ذہنوں کو نصیحت کرنی ہو ہر طرح کے ادبی معاملے کے لیے خطوط کے ذریعے کام کیا جاتا تھا اور ادب کی اہمیت اس قدر تھی کہ خصوصی طور پر نئی آنے والی کتب پر تبصرے کے لیے خطوط لکھے جاتے تھے۔

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی میں کئے گئے یہ تذکرے اس سارے دور کی نمائندگی کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ایک آپ بیتی لکھنے والا انسان صرف اپنی ذات کو موضوع نہیں بناتا بلکہ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی ہوگی اور جس ماحول میں اس نے پرورش پائی اس سارے دور کو مصنف کی آپ بیتی بیان کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اہم بات یہ کہ صرف خاص ادبی حلقہ نہیں اس چیز کو اہم جانتا تھا بلکہ ہر عام و خاص نئی آنے والی کتاب، نئے شائع ہونے والے رسالے پر بات کرتا تھا اور انہی موضوعات پر محفلیں منعقد کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی میں ادبی فکر کا بھی ذکر کیا ہے جس کا خاص تعلق علامہ اقبال سے ہے۔ جوش کا ابتدائی شعری مجموعہ تصوف کے حوالے سے تھا اور علامہ اقبال نے ان کو شعری فکر بدلنے کی نصیحت کی اور علامہ اقبال کی اس نصیحت نے جوش ملیح آبادی پر غیر ارادی طور پر اثر کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں جوش ملیح آبادی نے اپنی شعری فکر اور موضوع کو تصوف سے سیاست و تجسس میں بدل دیا۔ تب تک علامہ اقبال کی شاعری کا موضوع عشق و عقائد کی جانب مڑ چکا تھا۔ چنانچہ جوش ملیح آبادی علامہ اقبال کی اس فکری تبدیلی کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"چوں کہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے اور بلا کے ذہین تھے، اس لیے شروع شروع میں انھوں نے مغرب کے الحاد اور مشرق کے مابین مصالحت کی بڑی خلوص کے ساتھ کوشش کی، لیکن جب ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی تو انھوں نے نیٹے کے "ما فوق البشر" کو مشرف باسلام کر کے "شاہین بچہ" بنادیا۔ قرآن کے مردود لفظ "عشق" کو آسمان پر چڑھا کر اسے تمام انسانی شرف و مجد کا مرکز تسلیم کیا اور قرآن کے محبوب لفظ "عقل" کو خاک میں ملا کر اس کو تمام مفسد کا سرچشمہ ٹھہرا دیا۔" (۲۵)

جوش ملیح آبادی علامہ اقبال کے عشق کے نظریے سے متفق نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوش ملیح آبادی عشق و عقل کے فلسفے میں عقل کو اور عقلی دلیل کو اہم سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ خدا اور مذہب کے معاملے میں الجھاؤ کا شکار رہے کیونکہ وہ ہر معاملے میں عقلی دلیل کو سرفہرست رکھتے تھے اور مذہب کے معاملے میں بعض عقائد سے وہ اس لیے انحراف کرتے ہیں کہ ان کے بقول ان کی عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔ سو اس نظریے سے دیکھا جائے تو فکری لحاظ سے علامہ اقبال اور جوش میں تضاد تھا لیکن ادب و احترام کا ایک تعلق بھی برقرار تھا۔ یعنی جوش عقل کے قائل تھے اور علامہ اقبال عشق کے قائل تھے۔ اس سے یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ فکری و نظریاتی اختلاف علمی بنیاد پر ہو تو ذاتی نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔ جوش نے علامہ اقبال کی نصیحت کو تسلیم کیا اور اپنی شاعری کا موضوع بدلا اور پھر شاعر انقلاب کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ جوش کی آپ بیتی میں اس تذکرے سے یہ وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ اختلاف، ادب و احترام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا اگر اس کی نوعیت علمی ہو تو اختلاف خوبصورتی اختیار کرتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کا پہلا شعری مجموعہ جس کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ روح ادب ہے۔ اس کا موضوع تصوف تھا اور اس کے بعد جوش نے اپنی شاعری کا رخ سیاست اور باقی موضوعات کی طرف کر دیا۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی میں ادبی لحاظ سے جہاں اپنی شعر گوئی کی اجازت اور شاعری کی ابتدا کا ذکر کیا ہے وہیں انھوں نے اس مشاعرے کا بھی ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے شرکت کی اور اس مشاعرے میں وہ اپنے والد صاحب کے ساتھ تشریف لے گئے۔ جہاں انھوں نے پہلی بار اپنا کلام بھی پیش کیا۔ جوش نے اس مشاعرے کی منظر کشی اس طرح سے کی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والا اس مشاعرے میں موجود ہے۔ مشاعرے کے اس منظر کو پڑھنے والا بخوبی روایتی مشاعرے کو سمجھ سکتا ہے۔ مشاعروں کا ماحول، اور اس کی تمام رنگینیاں، داد دینے کا طریقہ ہر چیز سامنے آ جاتی ہے اور آج کے قارئین اس دور کی ادبی محفلوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس سے اپنی محفلوں کے لیے نصیحت بھی

لی جاسکتی ہے کہ اسی طرز کی محفلوں کا انعقاد کیا جائے۔ اس مشاعرے کے علاوہ بھی جوش ملیح آبادی نے مشاعروں کا ذکر کیا ہے لیکن ایک تو یہ ان کی زندگی کا پہلا مشاعرہ تھا جس میں انھوں نے بطور شاعر شرکت کی تھی، دوسری چیز یہ ہے کہ اس مشاعرے کے متعلق جوش نے جو تفصیل بیان کی ہے باقی مشاعروں کا ذکر اس طرح نہیں کیا بلکہ صرف ایک عمومی ذکر کیا ہے۔ جوش نے مشاعرے میں موجود شعراء کے پہناوے کو بھی موضوع بحث بنایا ہے جیسا کہ کوئی شاعر ایسا نہیں تھا کہ جس کے سر پہ ٹوپی نہ ہو۔ اس سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ مشاعروں پر ادب کے علاوہ ثقافتی رنگ بھی چھایا ہوا تھا۔ ادبی محفلوں کے بھی آداب ہوا کرتے تھے جس میں بڑے چھوٹے کا احترام، سرگوشی سے اجتناب جیسی چیزیں شامل ہیں جیسا کہ جوش اس کے آداب میں سے ایک عنصر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"کس کی مجال کہ اثنائے غزل خوانی میں کوئی مصرع نہ اٹھائے، حقہ پی لے، پان کھالے، آپس میں سرگوشی کرنے لگے یا کوئی ادھر سے اٹھ کر ادھر بیٹھنے کی جسارت کر سکے۔" (۲۶)

مشاعرے کے منظر سے کئی چیزیں سمجھ میں آتی ہیں کہ ادب و احترام کو ہر صورت ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا اور نئے شاعروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی تاکہ وہ آنے والے وقتوں میں اپنے اس فن سے بہترین مقام حاصل کر سکیں۔ جوش ملیح آبادی نے مشاعرے میں اپنے کلام کا بھی ذکر کیا ہے کہ انھوں نے پہلی بار مشاعرے میں کلام سنایا اور اس سے پہلے جب ان کو دعوت کلام دی گئی تو اس منظر کو بیان کرتے ہیں جس میں وہ اس چیز کا ذکر کرتے ہیں کہ اتنے بڑے شعراء کی صفوں کے درمیان بیٹھنا ان کے لیے کتنا مشکل تھا اور پھر جب انھوں نے کلام سنانا شروع کیا تو ایک اہم ادبی شخصیت مرزا محمد ہادی رسوا نے ان کا حوصلہ بڑھایا جس سے جوش کی گھبراہٹ میں کمی آئی اور انھوں نے کلام کا آغاز کیا اور خوب داد سمیٹی۔ جوش کے بقول جب انھوں نے اس مشاعرے میں شرکت کی ان کی عمر ۱۳ سال تھی اور انھوں نے مشاعرے میں نہ صرف شرکت کی بلکہ کلام بھی سنایا اور داد بھی سمیٹی۔ جوش کی شاعری کے بارے میں ظفر محمود کے بقول

"جوش کے گھر پر اکثر مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے شاعر ان کے گھر آیا کرتے تھے۔۔۔ اس کے علاوہ ان کی گھٹی میں شاعری تھی ان کا ضمیر ہی شاعری کا بنا ہوا تھا۔ شاعری انہیں وراثت میں ملی تھی۔" (۲۷)

اس ادبی منظر نامے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت میں چھوٹی سی عمر سے ہی ادبی لحاظ سے تیار کیا جاتا تھا کوئی شاعری میں جو ہر دکھانا چاہ رہا ہے تو اس کے اس فن کو خاص بنانے میں اس کی مدد کی جاتی تھی اس پر وقت صرف کیا جاتا تھا اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی کیونکہ ماحول پر بھی ادب ہی چھایا ہوا

تھا۔ کوئی نثر نگاری میں بہترین ہے تو اس کی اس چیز میں مدد کی جاتی تھی اس کی اصلاح کی جاتی تھی یعنی نوجوان طبقے پر گہری نظر تھی کہ کون آگے چل کر کس صنف میں بہترین کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ نئے ابھرتے شعراء پر خاص توجہ دی جاتی تھی ان کے لیے سنجیدگی سے ادبی لحاظ سے سوچا جاتا تھا اور ہر کام میں ان کو داد ملتی تھی۔ اس مشاعرے میں جوش ملیح آبادی کو ان کے کلام کی وجہ سے بہت داد ملی اس مشاعرے میں ان کے والد بھی شامل تھے۔ اس داد ملنے پر جوش کے والد ان پر غصہ ہوئے کہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ باپ سے زیادہ بیٹے کو داد ملے اور اس کے بعد ان کا مشاعروں میں ایک ساتھ جانا ترک کر دیا۔ جوش نے والد کے اس عمل کو برائی نہیں گردانا بلکہ جوش نے اس عمل کو ایک ادبی نکتہ نظر سے بیان کیا ہے کہ وہ اس نظریے کے قائل ہیں کہ ادب بذات خود ایک خود غرض چیز ہے۔ ان کے والد چاہتے تھے کہ جوش ملیح آبادی زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھیں لیکن اس چیز کو ناقابل برداشت حد تک بیان کیا۔ اس ضمن میں جوش لکھتے ہیں کہ انھوں نے بڑی بھاری آواز میں یہ فرمایا، دیکھیے صاحب یہ میری دلی تمنا ہے کہ آپ اس دنیا میں پھیلیں پھولیں، عمر مسیح و خضر پائیں۔ آپ کی دولت میری دولت سے بڑھ جائے، آپ کا مرتبہ مجھ سے ہزار گنا فزوں ہو جائے۔ آپ زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لے جائیں مجھ سے۔ مگر کان کھول کر سن لیجیے کہ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ خاں صاحب آپ مجھ سے شاعری میں بھی بڑھ جائیں۔ رات کے مشاعرے میں آپ کو مجھ سے زیادہ داد ملی، اب آپ کا میرے ساتھ مشاعرے جانا بند۔ قطعی بند۔ غضب خدا کا، باپ سے زیادہ بیٹے کو داد ملے۔ یہ الٹی گنگا بہنے کا موقع نہیں دینے کا۔ (۲۸)

شاعری ادب کی وہ صنف ہے جس میں اس طبقے کے درمیان چپقلش رہنا عام بات ہے اور یہ عمل زیادہ تر ہم عصر شعراء کے درمیان پایا جاتا ہے کیونکہ ایک مقابلے کی فضا بن جاتی ہے جس کی وجہ سے معاصرانہ چشمک جنم لیتی ہے۔ اس کے علاوہ جوش ملیح آبادی نے آپ بیتی میں اپنے والد کی شاعرانہ طبیعت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے والد اردو شاعر تھے اور ایسا شعر جس میں فارسی تراکیب کا استعمال ہو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ اس چیز کے قائل تھے کہ اردو شاعری میں خاص اردو کا رنگ ہونا چاہیے فارسی تراکیب و اصطلاحات کا استعمال نہیں ہونا چاہیے اور جوش اگر اپنے کسی ایسے شعر کی ان سے اصلاح لیتے جس میں فارسی تراکیب ہوتیں تو ان کے والد ان کی اصلاح کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ اردو اور اردو شاعری کے معاملے بہت سنجیدہ تھے۔ شاعری اور مشاعروں کے علاوہ جوش ملیح آبادی نے جو ادبی تذکرہ اپنی آپ بیتی میں کیا ہے وہ رسائل کا اجراء ہے۔ جوش ملیح آبادی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ رسائل کے مدیر بھی رہے ہیں۔ آپ بیتی میں جوش ملیح آبادی نے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے۔ یہ رسالہ جوش ملیح آبادی دہلی سے نکالتے تھے۔ اس کے

اجراء کی ابتداء سے آخر تک جوش کو کوئی نہ کوئی مشکلات درپیش رہی ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے دہلی سے کلیم کا اجراء ۱۹۳۵ء میں کیا اور یہ سلسلہ ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔ اس کی ابتداء جوش نے معاشی حالات کی خرابیوں کے باعث کی اور اس کے موضوعات اور مضامین زیادہ تر سیاسی نوعیت کے تھے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے اس رسالے میں ہر وہ موضوع شامل کیا جس کے بعد ان کے مخالفین میں اضافہ ہوا جیسا کہ انگریز حکومت کے خلاف لکھنا، اور اس کے علاوہ ہر وہ معاملہ جس سے جوش کو اختلاف تھا انھوں نے اس کی پالیسی میں شامل کیا۔ جوش ملیح آبادی رسالہ کلیم کے متعلق ذکر کرتے ہیں:

"کلیم کی روز افزوں ترقی نے میرے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دیے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا، اس لیے کہ فرنگی حکومت کی تہدیم، سرمایہ داری کی تدفین، سوشلزم کی تبلیغ، اقوال و ادہام کی تضحیک، فکر و تامل کی ترغیب، کانگریس کی تحکیم اور مسلم لیگ کی تنقیص، اس کی پالیسی میں داخل تھی اور اسی بنا پر شاہ (فرنگی) اور شاہ صاحب دونوں مجھ سے بگڑ گئے تھے۔" (۲۹)

جوش ملیح آبادی برصغیر کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے اپنے قلم کو غلامی کی زنجیروں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ انگریز سامراج کے عہد میں ان کی جراتِ اظہار اپنی مثال آپ تھی۔ انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے استعمار کے خلاف ایک فکری و عملی بغاوت برپا کی۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے رسالہ "کلیم" جاری کیا جو دراصل ان کی انقلابی سوچ اور آزادی فکر کا مظہر تھا۔ اس رسالے میں وہ انگریز حکومت، طبقاتی نا انصافی، استحصالی نظام اور غلامانہ ذہنیت کے خلاف کھل کر لکھتے رہے۔ یہی وہ جراتِ بیانی تھی جس نے انہیں سامراجی قوتوں کی آنکھوں میں کھٹکنے والا بنادیا۔ انہیں قتل کی دھمکیاں دی گئیں، مالی دباؤ ڈالا گیا، حتیٰ کہ حکومتِ برطانیہ کی طرف سے پیشکش کی گئی کہ اگر وہ سوشلزم کے خلاف اور انگریز کی حمایت میں لکھیں تو انہیں مراعات دی جائیں گی لیکن جوش نے اس پیشکش کو یکسر مسترد کر دیا۔ وہ اپنی خودداری اور آزادیِ ضمیر کے اتنے پابند تھے کہ فقر کی انتہا پر بھی اپنے نظریے کا سودا نہ کیا۔ یہی ان کا کلیسی دور کہلاتا ہے، جب انھوں نے معاشی تنگی، سیاسی دباؤ اور جانی خطرات کے باوجود حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑا۔ سیاست ہو یا ادب، جوش نے ہمیشہ خودداری، اصول پسندی اور انسان دوستی کو مقدم رکھا۔

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی "یادوں کی برات" میں ان کے وسیع ادبی و سماجی تعلقات کا بھرپور عکس ملتا ہے۔ ان کے احباب کی فہرست نصف صدی سے زائد شخصیات پر مشتمل ہے، جن میں شعراء، ادباء، صحافی اور سیاستدان سب شامل ہیں۔ ان کے دوستوں میں حکیم آزاد انصاری، فانی بدایونی، فراق گورکھپوری، اسرار الحق مجاز، مانی جاسی، اور خصوصاً مہندر سنگھ بیدی سحر جیسے شاعر شامل ہیں جو بیک وقت

سیاست اور ادب دونوں میدانوں میں فعال تھے۔ جوش کے مزاج میں جو وسعت اور خلوص تھا، اس کی جھلک ان کے ان تعلقات میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اسی طرح ان کے صحافی دوستوں میں سردار دیوان سنگھ مفتون کا ذکر نہایت اہم ہے، جو ہفت روزہ رسالہ "ریاست" کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ جاگیرداروں، نوابوں اور استحصالی طبقے کے خلاف لکھنے کے لیے مشہور تھا۔ جوش نے اپنی آپ بیتی میں ان تمام رفقاء قلم کا نہ صرف تذکرہ کیا بلکہ ان کے مزاج، عادات اور فکری رجحانات کی تفصیلات بھی بیان کیں، یہاں تک کہ ان کے بیانات سے ایک مکمل ادبی تذکرہ ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی صرف ان کے سیاسی یا سماجی خیالات تک محدود نہیں بلکہ اس میں ان کی ادبی زندگی کے کئی پہلو بھی شامل ہیں۔ انھوں نے فلمی دنیا سے وابستگی اختیار کی اور فلموں کے لیے گیت، مکالمے اور نغمے تحریر کیے، جنھوں نے ان کی تخلیقی قوت کا ایک اور رخ ظاہر کیا۔ بعد ازاں وہ سرکاری رسالہ "آج کل" کے مدیر مقرر ہوئے، جہاں انھوں نے ادب کو عوامی شعور کے ساتھ جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔ پاکستان آنے کے بعد جوش کو مالی مشکلات کا سامنا رہا، مگر انھوں نے "ترقی اردو بورڈ" اور بعد میں "اردو لغت بورڈ" کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا جہاں ان کی کاوشوں سے اردو زبان کی ترویج اور تدوین لغت کا سلسلہ منظم ہوا۔ اس طرح جوش کی زندگی کا سفر رسائل کی ادارت سے لے کر فلمی تحریروں اور لغت نویسی تک — ایک ایسے ادیب کی تصویر پیش کرتا ہے جو ہر حال میں ادب کو انسانیت، سچائی اور آزادی کے پیغام سے جوڑتا رہا۔

یوں "یادوں کی برات" نہ صرف ایک شخص کی داستانِ حیات ہے بلکہ برصغیر کے سیاسی، ادبی اور فکری ارتقا کی تاریخ بھی ہے، جس میں جوش ملیح آبادی کا وجود ایک عہد کی آواز، ضمیر اور مزاحمت کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔

یادوں کا جشن اور یادوں کی برات کا تقابل:

اشتراکات:

۱. یادوں کی برات اور یادوں کا جشن دونوں آپ بیتیوں میں مشاعروں کا ذکر یکساں طور پر ملتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ دونوں مصنفین ادبی لحاظ سے شاعری میں اہم مقام رکھتے تھے۔
۲. اردو شاعری سے محبت اور اس کی اہمیت دونوں آپ بیتیوں میں بیان کی گئی ہے۔

۳. دونوں آپ بیتیوں میں شعراء حضرات اور احباب کے خاکے بخوبی بیان کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ شخصیات سامنے موجود ہیں۔
۴. اردو زبان و ادب کی اہمیت کو اپنے اپنے انداز میں دونوں آپ بیتیوں میں بیان کیا گیا ہے۔
۵. ذاتی طور پر دونوں مصنفین نے اپنے شاعری کے فن کی ابتدا کو موضوع بحث لایا ہے۔
۶. دونوں شعراء ہم عصر تھے اسی وجہ سے دونوں آپ بیتیوں میں ادبی محفلوں کا ایک جیسا ذکر ملتا ہے۔
۷. دونوں شعراء اردو کی خدمت کے لیے اپنے طور کسی نہ کسی ذریعے سے منسلک رہے ہیں۔ جیسا کہ جوش ملیح آبادی تدوین لغت کے ادارے سے منسلک رہے اور مہندر سنگھ بیدی بھارت میں اردو لٹریچر سوسائٹی سے منسلک رہے۔
۸. دونوں آپ بیتیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شعراء کے ہاں شاعری کے اُستاد کا ذکر نہیں پایا جاتا۔
۹. دونوں شعراء کسی نہ کسی عرصے میں مختلف طریقے سے فلمی دنیا سے منسلک رہے ہیں۔

انفراقات:

۱. یادوں کی برات میں جو مشاعروں کا ذکر ہے اس کو مصنف نے بطور شاعر بیان کیا ہے جبکہ یادوں کا جشن میں مصنف نے بطور منتظم مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مہندر سنگھ بیدی نے اپنی زندگی کا ایک عرصہ مشاعروں کی نظامت میں گزارا ہے۔ دونوں مصنفین کے ہاں اپنے تجربے کی بنیاد پر مشاعروں کا ذکر ملتا ہے۔
۲. یادوں کا جشن میں ادبی منظر ناموں کو ملکی حالات سے منسلک کر کے بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ یادوں کی برات میں ادبی منظر نامہ ذاتی حد تک ہی بیان ہوئے ہیں۔
۳. مہندر سنگھ بیدی فلمی دنیا میں جب آئے تو انھوں نے فلم سازی بھی کی جب کہ جوش ملیح آبادی نے فلموں کے لیے مکالمے اور گیت لکھے۔
۴. یادوں کا جشن میں پاکستانی اور بھارتی اداکاروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جب کہ یادوں کی برات میں ایسی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔
۵. یادوں کا جشن میں مشاعروں کا خاص ذکر کیا گیا ہے اور باقاعدہ طور پر مشاعروں کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے یہاں تک کہ مشاعروں میں آنے والے سامعین کی اقسام بھی بیان ہوئی ہیں اور شعراء کو

مدعو کرنے کے طریقے کی بھی وضاحت کی گئی ہے جب کہ یادوں کی برات میں تفصیل سے ایک ہی مشاعرے کا ذکر ملتا ہے جو شاعر کی زندگی کا پہلا مشاعرہ تھا اس میں انھوں نے مشاعرے کا ماحول بیان کیا ہے اور شعراء کے کلام کا ذکر کیا ہے۔

۶. یادوں کا جشن کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔ سادہ الفاظ میں ہر منظر کو بیان کیا گیا ہے، عام فہم زبان استعمال ہوئی ہے جب کہ یادوں کی برات کی زبان بھی سادہ اور عام فہم ہے مگر شاعرانہ زبان کا بھی استعمال کیا گیا ہے فارسی اشعار کا ذکر ملتا ہے۔

یادوں کا جشن اور یادوں کی برات دونوں اردو خود نوشت نگاری کے دبستان میں ایسے شاہکار کے طور پر سامنے آتی ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنی صداقت، بے باکی اور فکری وسعت کے باعث ادب میں ایک نیا معیار قائم کیا بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظر نامے کو بھی پوری تہہ داری کے ساتھ آئینہ بنادیا۔ یہ دونوں کتابیں محض زندگی کے قصے نہیں بلکہ ایک پورا زمانہ ہیں۔ ایک ایسا زمانہ جو اپنی فکری تپش، سیاسی انتشار، ادبی جوش اور شخصی کرب کے ساتھ قاری کے سامنے زندہ ہوا اٹھتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" میں زبان کا آتشیں شور، انقلابی جرات، اور ایک شاعر کے دل کی بے تابی بولتی ہے، جب کہ "یادوں کا جشن" کی روحانی نزاکت، داخلی تجربات اور ایک صاحب شعور بیوروکریٹ کی چشم پینا جھلکتی ہے۔ ان دونوں خود نوشتوں میں ایک طرف ذاتی زندگی کے کرب، خواب اور شکست و ریخت کی کہانیاں ہیں تو دوسری طرف برصغیر کی فکری و سیاسی تاریخ کی دھڑکن۔ گویا یہ دونوں تخلیقات اردو ادب کے دو الگ مزاجوں کی نمائندہ ہیں۔ ایک میں جوش کی طرح آتش فشاں لاوا ہے، دوسری میں شہاب کی طرح شفق کی نرمی۔ مگر دونوں کا اشتراک اس بات میں ہے کہ یہ محض سوانح نہیں بلکہ اپنے عہد کے فکری و تاریخی شعور کی تخلیقی تصویریں ہیں جہاں "یاد" ایک ادبی کینوس بن جاتی ہے اور زندگی اپنی تمام رنگارنگی، تضاد اور سچائی کے ساتھ قاری کے سامنے ایک جیتے جاگتے منظر نامے میں ڈھل جاتی ہے۔

حوالہ جات

۱. اسلم اعوان، ادب، شعوری زندگی کا عکس، (ہم سب، ۲۰۲۳ء)
۲. ملیحہ وزیر حسین، آپ بیتی کا فن اور جہان دانش، (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۷ء)، ص ۴
۳. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، (جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء)، ص ۲۶۸۔
۴. مالک رام، "توقیت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر" مشمولہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ فن اور شخصیت مرتبہ نارنگ ساقی، عقیل احمد (نئی دہلی: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریچر ٹرسٹ، ۲۰۲۳ء)، ص ۳۰۔
۵. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، ایضاً، ص ۲۶۸۔
۶. ایضاً، ص ۲۶۹۔
۷. محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی، مونوگراف کنور سنگھ بیدی سحر، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۲۱ء)، ص ۶۸۔
۸. فاروق ارگلی، "کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اردو کے سکھ نعت گو شاعر" مشمولہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ فن اور شخصیت مرتبہ نارنگ ساقی، عقیل احمد (نئی دہلی: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریچر ٹرسٹ، ۲۰۲۳ء)، ص ۷۳۔
۹. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، ایضاً، ص ۷۲۔
۱۰. ایضاً، ص ۷۲۔
۱۱. محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی، مونوگراف کنور سنگھ بیدی سحر، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۲۱ء)، ص ۶۸۔
۱۲. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، ایضاً، ص ۸۰۔
۱۳. ایضاً، ص ۲۹۰۔
۱۴. ایضاً، ص ۱۶۵۔
۱۵. ایضاً، ص ۲۶۲۔
۱۶. ایضاً، ص ۲۶۷۔

۱۷. واصف حسین، مزاح کے انسانی نفسیات پر اثرات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، (بہاولپور: تحقیقی مجلہ الامیر، جلد ۱، شمارہ ۱)، ص ۱۴۔
۱۸. کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، ایضاً، ص ۸۶۔
۱۹. ایضاً، ص ۹۰۔
۲۰. ایضاً، ص ۵۲۰۔
۲۱. جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، (کراچی: جوش اکیڈمی، ۱۹۷۲ء)، ص ۱۴۔
۲۲. ایضاً، ص ۱۵۔
۲۳. ایضاً، ص ۱۶۔
۲۴. ایضاً، ص ۱۷۔
۲۵. ایضاً، ص ۱۶۰۔
۲۶. ایضاً، ص ۱۲۰۔
۲۷. ظفر محمود، جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۵۔
۲۸. جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ایضاً، ص ۱۲۲۔
۲۹. ایضاً، ص ۲۲۹۔

ما حصل

ماحصل

اردو ادب کی تاریخ میں خود نوشت سوانح نگاری ہمیشہ سے ایک اہم صنفِ نثر رہی ہے جس کے ذریعے نہ صرف فرد کی ذاتی زندگی کے تجربات اور احساسات سامنے آتے ہیں بلکہ اس کے عہد کے سماجی، تہذیبی اور سیاسی حالات بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ آپ بیتی دراصل ایک ایسی آئینہ دار صنف ہے جو فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی تناظر میں جوش ملیح آبادی کی یادوں کی برات اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی یادوں کا جشن اردو ادب کی دو ایسی بلند پایہ آپ بیتیاں ہیں جن میں مصنفین نے اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کو نہایت جرات مندی اور فکری بصیرت سے پیش کیا ہے۔ موجودہ مقالہ انہی دونوں شخصیات کی آپ بیتیوں میں سیاسی شعور کا تقابلی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ اس مطالعے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ دونوں مصنفین نے اپنے اسلوب، فکر اور تجربات کے ذریعے اپنے زمانے کی سیاسی فضا کو کس طرح محسوس کیا، برتا اور اسے تخلیقی سطح پر کس طور پر منتقل کیا۔ یہ مقالہ نہ صرف سیاسی شعور کے ادبی مظاہر کا جائزہ لیتا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں موجود فکری رویوں اور اسلوبیاتی فرق کو بھی نمایاں کرتا ہے تاکہ اردو خود نوشت نگاری کے سیاسی اور فکری جہتوں کو نئے تناظر میں سمجھا جاسکے۔ میرے مقالے کا عنوان "جوش ملیح آبادی اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی آپ بیتیوں میں سیاسی شعور کا تقابلی مطالعہ" ہے۔

اس مقالے کے لیے کچھ سوالات مد نظر رکھے گئے تھے جن کے جوابات تلاش کرنے کے لیے یہ مقالہ تحریر کیا گیا ہے۔ وہ سوالات ذیل ہیں:

۱. یادوں کی برات اور یادوں کا جشن میں دو مختلف المذاہب ادیبوں کا سیاسی شعور کن صورتوں میں سامنے آتا ہے؟

۲. جوش ملیح آبادی اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی آپ بیتیوں میں ایک وقت میں وقوع پذیر ہونے والے مشاعروں اور ادبی واقعات کو کس طرح پیش کیا گیا ہے؟

۳. جوش ملیح آبادی اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی آپ بیتیوں میں ایک ہی عصر کے سیاسی واقعات کو کس طرح واضح کیا گیا ہے؟

جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی "یادوں کا جشن" دو ایسی آپ بیتیاں ہیں جن میں دو مختلف المذاہب ادیبوں نے اپنے اپنے عہد کے سیاسی شعور کو نہایت فنکارانہ اور فکری گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دونوں کے ہاں سیاسی شعور محض کسی سیاسی تحریک یا واقعے کا بیان نہیں بلکہ اپنے زمانے کی اجتماعی فضا، سماجی ناہمواریوں، قومی بیداری اور فکری ارتعاش کی ایک جیتی جاگتی تصویر بن کر سامنے آتا ہے۔ جوش کی تحریر میں سیاسی شعور ایک بغاوت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ وہ جمود، ظلم، استبداد اور سامراجیت کے خلاف علم احتجاج بلند کرتے ہیں۔ ان کے یہاں آزادی، انقلاب اور عوامی خود مختاری کی للکار صاف سنائی دیتی ہے۔ دوسری طرف مہندر سنگھ بیدی سحر کا سیاسی شعور نسبتاً متوازن اور مصالحت پسند ہے۔ وہ تقسیم ہند کے دکھ، مذہبی منافرت اور انسانی المیے کو ایک انسان دوست زاویے سے دیکھتے ہیں۔ سحر کے ہاں سیاست جذباتی وابستگی نہیں بلکہ انسانی رشتوں اور ہم آہنگی کی جستجو کا ذریعہ ہے۔ یوں دونوں ادیب اپنے اپنے مذہبی اور فکری پس منظر کے باوجود ایک ایسے سیاسی شعور کے امین دکھائی دیتے ہیں جو فرد سے بڑھ کر معاشرے کی اجتماعی حالت پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کی آپ بیتیاں نہ صرف سیاسی تاریخ کی عکاس ہیں بلکہ ایک فکری سفر نامہ بھی ہیں جہاں انسان، سیاست، تہذیب اور انسانیت ایک دوسرے میں پیوست دکھائی دیتے ہیں۔

دونوں مصنفین کی آپ بیتیوں میں مشاعروں اور ادبی محفلوں کا بیان محض یادوں کی بازیافت نہیں بلکہ برصغیر کے ادبی مزاج اور تہذیبی روح کی بازگشت ہے۔ دونوں ادیبوں نے ایک ہی عہد کے مشاعروں، مناظروں اور ادبی نشستوں کو اس طرح قلم بند کیا ہے کہ ان کے ذریعے نہ صرف اس زمانے کی فکری حرارت بلکہ سماجی رویوں کی جھلک بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ جوش کے ہاں مشاعرہ صرف شعر خوانی کا موقع نہیں بلکہ ایک سیاسی اور فکری احتجاج کا استعارہ بن جاتا ہے۔ ان کی محفلوں میں لفظوں کی حرارت انقلاب کی چنگاری بنتی ہے، اور سامعین کے دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ مشاعروں کے ماحول کو ایک میدانِ جدل کی طرح دکھاتے ہیں جہاں شاعر قلم کے ذریعے ظلم کے ایوانوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ دوسری جانب مہندر سنگھ بیدی سحر انہی مشاعروں کو ایک تہذیبی روایت کے طور پر پیش کرتے ہیں جہاں اختلاف کے باوجود محبت، رواداری اور مشترکہ ثقافتی ورثے کی خوشبو بکھری ہوتی ہے۔ ان کے ہاں مشاعرہ دلوں کو جوڑنے اور زبان و تہذیب کے رشتوں کو مستحکم کرنے کا وسیلہ ہے۔ دونوں کے بیانات سے اس دور کی ادبی زندگی کی رونق، شاعرانہ انا، فکری مکالمہ اور زبان کی تازگی پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتی ہے۔ یوں یہ

آپ بیتیاں اس عہد کے ادبی مناظر کا ایسا آئینہ بن جاتی ہیں جس میں اردو ادب کا تہذیبی، فکری اور جمالیاتی وجود ایک ساتھ سانس لیتا نظر آتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" اور مہندر سنگھ بیدی سحر کی "یادوں کا جشن" میں ایک ہی عہد کے سیاسی واقعات اس فنی چابک دستی سے بیان کیے گئے ہیں کہ وہ محض تاریخ کا بیان نہیں رہتے بلکہ ایک جیتے جاگتے دور کی روح بن کر اُبھرتے ہیں۔ دونوں ادیب اپنے اپنے نقطہ نظر سے برصغیر کی سیاسی فضا کو پیش کرتے ہیں، لیکن ان کی نگاہ میں زمانے کا درد اور قوم کی بیداری مشترک ہے۔ جوش ملیح آبادی نے انگریز سامراج، آزادی کی تحریک، تقسیم ہند، اور آزادی کے بعد کے سیاسی خلفشار کو اپنے جذباتی، انقلابی اور احتجاجی لہجے میں قلم بند کیا ہے۔ ان کے ہاں سیاست صرف اقتدار کی کہانی نہیں بلکہ انسان کی آزادی اور شعور ذات کی جنگ ہے۔ دوسری جانب مہندر سنگھ بیدی سحر نے انہی واقعات کو محبت، رواداری اور باہمی احترام کے زاویے سے دیکھا۔ ان کی نثر میں تقسیم کا دکھ اور انسانیت کے زخموں کی سلگتی ہوئی راکھ محسوس ہوتی ہے۔ وہ سیاست کے پس منظر میں انسان کی شکستگی، وطن کے بٹوارے کی ٹوٹ پھوٹ اور دلوں کے بچھڑنے کی کہانی سناتے ہیں۔ دونوں کے ہاں سیاسی واقعات محض واقعات نہیں بلکہ ایک تہذیبی المیے کا روپ دھار لیتے ہیں جہاں جوش کا قلم آتش فشاں بن جاتا ہے، وہیں بیدی کا قلم اشکوں کی نمی سے تر دکھائی دیتا ہے۔ یوں ان کی آپ بیتیاں ایک ہی دور کے دو زاویے ہیں جن سے ایک عہد کی پوری سیاسی و انسانی تاریخ جھانکتی ہے۔

دونوں آپ بیتیاں اردو ادب کی خودنوشت روایت میں نہایت اہم اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔ دونوں ادیب بیسویں صدی کے نمایاں شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ اپنی آپ بیتیوں کے ذریعے بھی ادب کی ایک نئی جہت کو جنم دیا۔ اگرچہ دونوں کا عہد ایک ہی ہے، مگر حالات و واقعات کو پیش کرنے کے انداز میں نمایاں فرق ملتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت میں انقلابی جذبے، فکری بغاوت، اور انسان دوستی کے جذبات کو بڑی شدت سے پیش کیا ہے، جب کہ مہندر سنگھ بیدی سحر نے واقعیت، توازن اور انسانیت کے احترام کو اپنا اسلوب بنایا۔ دونوں کی آپ بیتیاں اپنے اپنے انداز میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی مناظر کو آئینے کی طرح منعکس کرتی ہیں۔

اسلوبی اعتبار سے دونوں خودنوشتیں اردو نثر کے فنی ارتقاء کی بہترین مثال ہیں۔ جوش کا اسلوب آتشیں، خطیبانہ اور جذبے سے لبریز ہے۔ وہ لفظوں میں بغاوت کے شعلے بھرتے ہیں، زبان کو خطابت کا جوش

اور اظہار کا تلاطم عطا کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں شاعری کا بائکپن، تمثیل کی شدت اور بیان کی جاذبیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے برعکس بیدی سحر کا اسلوب متوازن، شائستہ اور مشاہدے پر مبنی ہے۔ وہ سادہ لفظوں میں گہری بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں، ان کی تحریر میں تہذیبی شرافت، فکری وقار اور انسانی ہمدردی کی روشنی جھلکتی ہے۔ یوں ایک کے ہاں زبان تپش جذبہ سے دہکتی ہے تو دوسرے کے ہاں وہ احساس و تفکر کی نرمی سے روشن۔

دونوں آپ بیتیاں اردو ادب میں محض ذاتی زندگیوں کے آئینے نہیں بلکہ پورے عہد کے تاریخی و تہذیبی شعور کی زندہ تصویریں ہیں۔ ان میں صرف دو افراد کی داستانیں نہیں بلکہ برصغیر کی اجتماعی روح بولتی ہے۔ جوش ملیح آبادی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر دونوں نے اپنے اپنے تجربات کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ انسانیت، زبان، اور تہذیب وہ بنیادیں ہیں جن پر ادب کی عمارت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خودنوشتیں نہ صرف ادبی ورثہ ہیں بلکہ اردو زبان و تہذیب کی شناخت کا ابدی حوالہ بھی ہیں۔

سفارشات

دونوں آپ بیتیوں میں سیاسی شعور کا جائزہ لینے کے بعد اُن کی تخلیقات کو دیگر پہلوؤں سے بھی دیکھا جاسکتا ہے جو کہ سفارشات کی صورت میں ذیل ہیں:

۱. دونوں آپ بیتیوں کا اسلوبیاتی جائزہ لیا جاسکتا ہے تاکہ مصنفین کے طرزِ بیان، زبان اور بیانیہ ساخت کا تقابلی مطالعہ کیا جاسکے۔
۲. جوش ملیح آبادی کی خودنوشت کا اپنے اردو ادب کے ہم عصر شعرا کی آپ بیتی سے تقابل بھی کارآمد ثابت ہوگا۔
۳. دونوں خودنوشتوں میں شناخت اور داخلی کرب کے اظہار پر نفسیاتی و فکری مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔
۴. دونوں آپ بیتیوں پر تہذیب و ثقافت کے حوالے سے بھی کام کیا جاسکتا ہے۔
۵. دونوں آپ بیتیوں کا دوسری سیاسی آپ بیتیوں سے تقابل کیا جاسکتا ہے۔
۶. جوش ملیح آبادی کی شاعری میں سیاسی شعور پر تحقیقی و تنقیدی کام کیا جاسکتا ہے۔

فهرست مآخذ

فہرست مآخذ

- احمد، ظہور۔ داستان تاریخ ریور تاژ نگاری۔ پشاور: صدر ادارہ علم و فن، ۱۹۹۹ء۔
- اختر، حسن۔ تہذیب و تحقیق۔ لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۵ء۔
- اعوان، اسلم۔ ادب، شعوری زندگی کا عکس۔ ہم سب، ۲۰۲۳ء۔
- امام، فضل۔ شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی۔ نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء۔
- انجم، خلیق۔ جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء۔
- انور، صمیم۔ اردو میں خود نوشت سوانح حیات۔ لکھنؤ: مطبع نامی پریس، ۱۹۸۲ء۔
- بٹ، عاصم۔ "جوش ملیح آبادی نمبر"۔ ادبیات، شمارہ (۲۰۱۰ء)۔
- بیگم، نسرین۔ جوش ملیح آبادی کی نثری خدمات۔ نئی دہلی: ادارہ بزم خضر راہ، ۲۰۰۲ء۔
- بھارتی، شان۔ "گوشہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر"۔ رنگ، شمارہ (جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۱۱ء)۔
- جاوید، عمر۔ یادوں کا جشن: ایک منفرد آپ بیتی، (مضمون)، (جونیور، ۱۹ جولائی، ۲۰۱۷ء)
- جوش ملیح آبادی۔ (مضمون)، آرٹ گیلری، فروری ۲۰۱۰ء۔
- حسین، شاہد۔ ادب سماج اور کلچر۔ اردو ریسرچ جرنل، ۲۰۲۰ء۔
- حسین، واصف۔ مزاح کے انسانی نفسیات پر اثرات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں۔ بہاولپور: تحقیقی مجلہ الامیر، جلد ۰۱، شمارہ ۰۱، ۲۰۲۳ء۔
- حسین، احتشام۔ جوش ملیح آبادی: انسان اور شاعر۔ لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۸۳ء۔
- حسین، مجتبیٰ۔ "کنور مہندر سنگھ بیدی سحر"۔ چوٹیاں رنگ و ہنسا، شمارہ (۲۰۱۱ء)۔
- حماد اللہ۔ پاکستانی سیاسی آپ بیتوں میں سیاسی، سماجی شعور کا تقابل۔ مقالہ برائے ایم فل اردو، اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۱۹ء۔

خال، انوار۔ اردو میں آپ بیتی نگاری کا آغاز و ارتقاء۔ مہاراشٹر: اشاعت گھر، ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء

دت، صابر۔ "آپ بیتی نمبر"۔ فن اور شخصیت، ج ۴، شمارہ (مارچ، ۱۹۸۰ء)۔

درانی، عطش۔ اردو اصناف کی مختصر تاریخ۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء۔

رحمانی، شہاب الدین۔ مونوگراف کنور سنگھ بیدی سحر۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۲۱ء۔

رفیع الدین۔ اصناف ادب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

رئیس، قمر۔ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ۔ دہلی: تخلیق کار پبلشر، ۲۰۰۵ء۔

ساقی، نارنگ۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ بھوپال: اقبال لاہیری، ۲۰۰۷ء۔

ساقی، نارنگ۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ فن اور شخصیت۔ نئی دہلی: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریچر ٹرسٹ، ۲۰۲۳ء۔

سروشہ، نسرین۔ جوش کی شاعرانہ عظمت۔ ناگپور: امین پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔

سنگھ، مہندر۔ یادوں کا جشن۔ جہلم: بک کارنر شوروم، ۲۰۱۷ء۔

شاہ بخاری، علی۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ۔ کوہاٹ: جامعۃ العلوم، ۱۹۸۳ء۔

شاہین، ریحانہ۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتوں میں عصری شعور کا تقابلی مطالعہ۔ اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، جون ۲۰۲۰ء۔

صدیقی، شاہد۔ "کنور مہندر سنگھ بیدی زندگی کے میلے اور محبت کا جادو"۔ روز نامہ دنیا (۲۰۱۸ء)۔

ظہور عالم، شیخ۔ تہذیب و ثقافت کا تصور اور اردو ادب۔ اردو ریسرچ جرنل، ۲۰۲۲ء۔

عابد، حسن۔ "جوش صدی نمبر"۔ ارتقا، ش (۲۰۰۰ء)۔

عالم، منظور، -تکریم انسانیت اور مسلمانوں کی ذمہ داری۔ (مضمون)، مشمولہ: نقطہ نظر،
۲۰۱۶ء

عبدالکریم، حسن۔ اردو کی اہم آپ بیتیاں۔ دہلی: دستاویز، ۲۰۱۶ء۔
عثمانی، ذیشان الحسن۔ شعور علم سے آگہی کا سفر۔ اسلام آباد: گفتگو پبلی کیشنز، اکتوبر ۲۰۱۷ء۔
فرز، احمد۔ مہندر سنگھ بیدی۔ دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۱۱ء۔

کاظمی، کامران۔ اردو ناول میں عصریت۔ لاہور: الو قار پبلیکیشنز، ۲۰۲۳ء۔
کمال، صابر۔ یادوں کی برات خصوصی مطالعہ۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۶ء۔
لئیق، ارشد۔ جوش ملیح آبادی: فکرو نشاط کے شاعر (مضمون، روزنامہ اردو، ۲۱ فروری
۲۰۲۳ء)۔

محمود، ظفر۔ جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
۱۹۹۸ء۔

ملیح آبادی، جوش۔ یادوں کی برات۔ کراچی: جوش اکیڈمی، ۱۹۷۰ء۔
مہر، غلام رسول۔ تاریخ کی تاریخ (مضمون، روزنامہ دنیا، ۲۵ جولائی ۲۰۲۲ء)۔
مودودی، ابوالاعلیٰ۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت۔ دہلی: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، ۱۹۷۱ء۔
ندیم، خورشید۔ سیاسی شعور یا سیاسی ہیجان۔ (مضمون، روزنامہ دنیا، ۲۰۲۳ء)

نقوی، ہلال۔ گم شدہ و غیر مطبوعات صفحات کی دریافت، یادوں کی
برات۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء۔

وزیر حسین، ملیحہ۔ آپ بیتی کا فن اور جہان دانش۔ اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،
۱۹۹۷ء

اردو لغات / فرهنگ

اُردو لغت تاریخی اصول پر (جلد اول تا بائیس)۔ کراچی، اُردو ڈکشنری بورڈ، سن۔

جالبی، جمیل۔ قومی انگریزی اردو لغت۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء۔

حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز۔ کشفِ تنقیدی اصطلاحات۔ اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم، ۱۹۸۵ء۔

دہلوی، احمد۔ فرهنگ آصفیہ۔ (جلد اول تا چہارم)، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۷۷ء

قریشی، صدیق۔ کشف اصطلاحات تاریخ۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء۔

نور الحسن، مولوی۔ نور اللغات (جلد اول تا چہارم)۔ اسلام آباد نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء۔

وارث، سرہندی۔ علمی اُردو لغت (جامع)۔ لاہور، علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۳ء۔